نگار

قیمت ۹ر

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان
حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانون کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک مین جو درجہ قبولیت حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانون مین منتقل کیے گئے قیمت علاوہ محصول ۱۲

جمالستان
ایڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ اسمین ۳۲ افسانے ۳۳ مقالے ہین جو تمکنت کے درج مین نمایان انشا قدرت بیان علو تخیل اور پاکیزگی جذبات کے بہترین شاہکار ہین علاوہ بہت سے اجتماعی معاشرتی مسائل کا حل بھی آپکو اس مجموعہ مین نظر آئیگا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے قیمت ... علاوہ

شہاب کی سرگزشت
حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان مین بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون و اسکی انشا پردازی سحر حلال کے درجہ تک پہونچی ہے قیمت علاوہ محصول عہ

فراست الید
مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی ساخت اور اسکی لکیرون کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح پیشگوئی کر سکتا ہے قیمت علاوہ محصول

شاعر کا انجام
جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کا تمام نشاط بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ مین موجود ہین یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اسقدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ مل نہین سکتی قیمت علاوہ محصول ۱۰ر

جذبات بھاشا
جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کیساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اردو مین بھی سب سے پہلی کتاب ... پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام ... ہمیشہ ... نہ ہو ... قیمت علاوہ ...

مکتوبات نیاز
ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار مین شایع ہو گئے ہین نیز وہ جو شایع نہین ہوئے۔ جذبات نگاری سلاست بیان رنگینی اور لطیفے پن کے لحاظ سے فن انشا مین بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے ... غالب بھی پھیکے ... ہوتے ہین۔ ... حضرت نیاز ... بجلد شایع ... قیمت ...

ترغیبات جنسی
اس کتاب مین فحاشی کی تمام مختلف اور غیر فطری قسمون کے حالات اور انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے اسمین بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا مین کب اور کیونکر رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج مین کتنی مدد کی اس کتاب مین آپکو حیرت انگیز واقعات نظر آئینگے۔ قیمت ...

مذاکرات نیاز
یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اسکو شروع کر دینا آخر تک پڑھ لینا ہے اس کتاب کی بہت کم جلدین باقی رہ گئی ہین قیمت ۱۲ر علاوہ محصول

فلاسفہ قدیم
اس مجموعہ مین حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہین
۱۔ چند گھنٹے فلاسفہ قدیم کی روحون کے ساتھ
۲۔ مادیین کا مذہب
۳۔ حرکت کے کرشمے
نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت عہ علاوہ محصول

تاریخ الدولتین
جرجی زیدان کے تاریخ تمدن الاسلام کی چوتھی جلد کا ترجمہ جسمین عہد بنی امیہ و بنی عباس کی سیاسات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ جرجی زیدان کی یہ کتاب بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی ہے قیمت عہ علاوہ محصول

مجموعہ استفسار و جواب
یہ جلد اول ہے جس مین ... سے لیکر ... تک کے ... جواب شایع کیے گئے ہین باقی دو جلدین زیر طبع اس مجموعہ کی اہمیت اظہار بیکار ہے کیونکہ ... جو خصوصیت اس باب حاصل ہے کسی سے مخفی نہین اس مجموعہ مین سینکڑون ... تاریخی ادبی و مذہبی مسائل ... قیمت ...

فراست التحریر مکمل
یعنی اردو و انگریزی رسم خط اور انداز تحریر دیکھکر ایک شخص کی سیرت چال چلن مستقبل اور تمام حالات معلوم کرنیکا فن اردو مین بالکل پہلی کتاب قیمت ... علاوہ محصول

دیگر مصنفین کی قابل مطالعہ کتابین

مثنوی لالہ رخ
طامس مور کی معرکۃ الآرا مثنوی کا مکمل ترجمہ ادبی شاہکار کا بہترین نمونہ قیمت معہ محصول عہ

مثنوی زہر عشق
مرتبہ مجنون گورکھپوری جسمین ملک کے چار بہترین ادیبون کا مقدمہ شامل ہے اور کئی تصویرین دی گئی ہین ایک تصویر ... رنگین

...ہ گل
... مین ۳۰۰ صفحات ... لطیف شاعرون ... طرائف ... معہ ...

نگار

جلد ۲۸	فہرست مضامین جولائی ۱۹۳۵ء	شمارہ (۱)

ملاحظات ــــــــــــ ۲

پارسی اہل کتاب ہیں ــــــ سید محمد طاہر رضوی ایم اے ــــــ ۹

دیر و حرم کے قصے (افسانۂ تاریخی) ــــــ پنڈت کشن پرشاد کول ــــــ ۲۲

مصطفیٰ کمال اور جنگ عظیم ــــــــــــ ۳۴

جھانسی کی رانی (ڈرامہ) ــــــــــــ ۴۴

مسئلہ خلافت و امامت ــــــ سید ابو سعید بزمی ــــــ ۵۳

آفتاب کی کرشمہ سازیاں ــــــ حافظ غازیپوری ــــــ ۶۲

باب المراسلہ والمناظرہ (اختر ریحانہ کی آپ بیتی) ــــــ ۶۵

باب الاستفسار (نور محمدی اور پل صراط) ــــــ ۷۳

منظومات ــــــ عدم - آسی ــــــ ۷۶

نگار

ایڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

شمارہ (۱)	جولائی سنہ ۱۹۳۵ء	جلد ۲۸

ملاحظات

ہماری مذہبی درسگاہیں اور ہمارے مذہبی رہنما

تمام تمدنی مسائل میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ جس کو مرکزی و اساسی حیثیت حاصل ہے اور جس سے ایک قوم کا مستقبل متفرع ہوتا ہے، تعلیم و تربیت کا مسئلہ ہے۔ کیونکہ انسان کی وہ خصوصیت خاصہ جو اسے دیگر مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے یہی ہے کہ وہ اپنی دماغی ساخت کے لحاظ سے ایک کائنات ترقی اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے۔ اور زمانہ کی رَو کو بھی اپنے اقدامات سعی و عمل کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اسی لئے دماغی و ذہنی تعلیم و تربیت کا مسئلہ ہر ملک اور ہر زمانہ میں بہت اہم مانا گیا ہے۔ اور اسی کی ترقی و اصلاح پر قوموں کی ترقی کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

جس وقت ظہور اسلام ہوا اہل عرب کا جہل انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اور کوئی اخلاقی خرابی ایسی نہ تھی جو اُن میں نہ پائی جاتی ہو۔ تفصیل کی ضرورت نہیں ہر شخص اس سے آگاہ ہے۔ ان میں سے ہر قبیلہ جانوروں کی سی درندانہ زندگی بسر کر رہا تھا اور تمام وہ امکانات خلافتِ الٰہی جو انسان کی فطری قوتوں میں خدا نے ودیعت کر دیئے ہیں تقریباً محو ہو چکے تھے۔ اُنھیں

کچھ خبر نہ تھی کہ انسان کیا چیز ہے اور اس میں کتنی غیر محدود قابلیت ترقی کی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے جو تعلیم پیش کی گئی وہ توحید کی تھی۔ اس سے مدعا صرف یہ تھا کہ بتوں کی پرستش سے جو اضمحلال ان کے قواء دماغی میں پیدا ہو گیا تھا وہ دور ہو اور وہ دوسروں پر بھروسہ کرنا چھوڑ کر خود اپنے قواء کا منہ سے کام لینا سیکھیں۔ پھر اس کیساتھ ساتھ ان کو یہ بھی ہدایت کی گئی کہ وہ ہر بات پر غور کرنے کی عادت ڈالیں۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور نوامیس فطرت کے خصائص کا مطالعہ کر کے کسی نتیجہ تک پہنچیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ کلام مجید تفکر و تدبر کی ہدایتوں سے بھرا پڑا ہے اور سب سے زیادہ زور اس نے اسی امر پر دیا ہے۔

پھر اسکا جو اثر ہوا وہ بھی تاریخ داں حضرات سے پوشیدہ نہیں۔ وہ کونسا علم تھا جو مسلمانوں کی سعی و کاوش سے بچا رہا اور وہ کونسی تحقیق تھی جس میں انھوں نے انتہائی سرگرمی سے کام نہیں لیا۔ اگر یورپ کی موجودہ ترقی کی تاریخی جستجو کی جائے تو اسکا سر رشتہ مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں نظر آئیگا اور علوم حالیہ کے ابتدائی خط و خال اگر دیکھنا ہوں تو اسلام کے عہد زریں کے اختراعات کو دیکھنا ضروری ہوگا۔ بہرحال مسلمانوں کی علمی، دماغی ترقیاں سب اسی تفکر و تدبر کا نتیجہ تھیں۔ اور ان کی تمام تعلیمی سرگرمیاں اسی اصول پر قائم تھیں۔ لیکن جب رفتہ رفتہ وہ عیش و راحت کے خوگر ہو کر اس جد و جہد سے غافل ہو گئے۔ تو اسکا نتیجہ وہی ہوا جو ہمیشہ ایک جگہ ٹھہر جانے والوں کا ہوا ہے۔

بعض لوگوں کا اعتراض ہے کہ یہ مذہب نہایت قدامت پرست واقع ہوا ہے اور اس میں ترقی کرنے کی صلاحیت موجود نہیں ہے۔ لیکن ایسا کہنا نتیجہ ہے بے خبری کا۔ کیونکہ حقیقتاً دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے سوائے عمل کے اور کچھ نہیں بتایا اور جو عبادت و طاعت کا بھی مفہوم صرف استعداد و ترقی قرار دیتا ہے۔ لیکن اسکی شکایت ہم کو غیروں سے کیا ہو سکتی ہے جبکہ اس حقیقت کو مسلمانوں ہی نے پس پشت ڈالدیا۔ اور انھیں کی ذہنیت نے مذہب کو دنیا سے علیحدہ کر کے اس کے مفہوم کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ یہانتک کہ آج ہماری درسگاہوں کی انتہائی معراج وہ ہے جو دار العلوم دیوبند اور دار العلوم ندوہ میں نظر آتی ہے۔ اور ہم میں سب سے بڑا مسلمان وہ سمجھا جاتا ہے جو یہاں پڑھتا ہے یا یہاں سے پڑھ کر باہر نکلتا ہے۔ سو آیئے۔ آج کی صحبت میں ایک غائر نگاہ ڈالکر ان کی حقیقت کا بھی جائزہ لے لیں۔ اور غور کریں کہ قوم کے بچوں کا مستقبل جن درسگاہوں اور جن اساتذہ کی تربیت میں سنوارا جا رہا ہے۔ اُن کا کیا حال ہے۔

تعلیم کا تنہا مقصود خواہ وہ کسی زبان کے ذریعہ سے دی جائے۔ محض تربیت اخلاق اور آزادی فکر و ضمیر ہے۔ یعنی ایک بچہ کو شروع سے صحیح معنی میں ایک انسان بننے کا درس دیا جائے اور اس کے دماغ میں آزادی کیساتھ سوچنے اور کسی نتیجہ پر پہنچنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہماری مذہبی درسگاہوں میں اگر فقدان ہے تو انھیں دو چیزوں کا۔ اور یہاں کا تعلیم یافتہ انسان اگر عاری ہوتا ہے تو انھیں دو خصوصیات سے۔ یعنی نہ اس میں متمدن دنیا کا ساتھ دینے کی صلاحیت ہوتی ہے اور نہ اس کے دماغ میں اس امر کی اہلیت کہ وہ صدیوں سال قبل کی تصانیف سے ہٹ کر کسی نئی بات پر

غور کرے - اسکا بڑا سبب یہ ہے کہ ہماری جتنی درسگاہیں ہیں - خواہ ان کو دار العلوم کہا جائے یا اس سے بھی زیادہ مرعوب کن نام "دار الحکم والفنون" سے یاد کیا جائے - خالص مذہبی درسگاہیں ہیں - اور ان کو علوم وفنون سے کوئی واسطہ نہیں - ان کا نصب العین صرف فقہ وحدیث کی تعلیم ہے اور اگر ان کیساتھ بعض اور علوم کی تعلیم ہوتی ہے تو وہ بھی صرف اس لئے کہ فقہ وحدیث کے سمجھنے کے لئے ان کی ضرورت ہوتی ہے - مثلاً عربی صرف ونحو کہ اسکا حقیقی مقصود تکمیل ادب وانشاء ہے - لیکن وہاں ان کی تعلیم صرف اس لئے ہوتی ہے کہ طالب علم ہدایہ اور بخاری کی عبارت صحیح پڑھ سکے - منطق وہیئت کی چند فرسودہ ابتدائی کتابیں بھی پڑھائی جاتی ہیں - لیکن صرف اس لئے کہ بعض فقہی مسایل کے استنتاج میں ان سے مدد ملتی ہے - علاوہ فقہ وحدیث کے تفسیر کا بھی درس ہوتا ہے - لیکن جلالین سے آگے نہیں بڑھتا - جس سے زیادہ سے زیادہ ضمایر کے مرجع وغیرہ کا علم حاصل ہوسکتا ہے - اور اگر بڑی ہمت کی تو کشاف کے بعض اجزاء پڑھا دیئے - الغرض ایک طالب علم کی زندگی کا بڑا حصہ صرف فقہ واحادیث کی کتابوں پر صرف ہو جاتا ہے - اور چونکہ حد درجہ جذبۂ تقدس واحترام کیساتھ ان کا مطالعہ کیا جاتا ہے، یہانتک کہ اگر دوران تعلیم میں کچھ شبہات بھی اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں تو وہ خوف خدا سے کانپ اٹھتا ہے اس لئے اسکی قوت نقد ودرایت بالکل تباہ ہو جاتی ہے اور جس وقت وہ ان درسگاہوں سے فارغ ہو کر نکلتا ہے - تو ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ کوئی خاص چیز ہے جسے خدا نے اپنے ہاتھ سے ڈھالکر اس دنیا میں بھیجا ہے اور علاوہ اسکی ذات کے اس عالم میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ یکسر باطل ہے -

اس کی ذہنی غلامی کا یہ رنگ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مزعومات کے علاوہ کچھ اور سننا ہی نہیں چاہتا - اور اس کا دماغی افلاس اس حد تک پہنچا ہوا ہوتا ہے کہ اگر اس سے پوچھا جائے کہ ہر چیز جو اچھالی جائے کیوں پھر زمین کی طرف مایل ہو جاتی ہے تو وہ سوائے خدا کی مرضی کے اور کوئی وجہ نہ بیان کر سکیگا -

جس زمین پر وہ بستا ہے - اسکا صرف اتنا علم اسے حاصل ہے کہ وہ چپٹی ہے اور کوئی فرشتہ اسے سنبھالے ہوئے ہے - اور جس آسمان کے نیچے وہ زندگی بسر کرتا ہے اسکا حال صرف اس قدر معلوم ہے کہ وہ پیاز کے چھلکے کی طرح تہ بہ تہ ہے جس میں چاند سورج میخوں کی طرح گڑے ہوئے ہیں - اور زمین کے گرد گھومتا رہتا ہے - جغرافیہ سے اسے مس نہیں - تاریخ سے اسے کوئی تعلق نہیں - ریاضی سے بالکل نابلد - سیاسیات ومعاشیات - کیمیا وطبعیات ودیگر علوم کا کیا ذکر کہ ان کا تو نام لینا بھی اسکی بارگاہ تقدس میں کفر کے مترادف ہے -

اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ پانچ وقت نہایت احتیاط سے مضمضہ واستنشاق کے ساتھ وضو کرے اس کے بعد کانوں میں انگلی دیکر اذان دے اور پھر صحیح مخارج سے قرآن کی چند آیتیں پڑھ کر امامت کر لے - اس سے زیادہ اور ترقی کریگا تو محلہ کے جاہلوں کو حلال وحرام کے مسایل بتائے گا - اور اگر کوئی بدنصیب داڑھی منڈا کر مسجد میں داخل ہو گا تو جہنم کے ساتوں دروازے اسکے سامنے کھولکر رکھدیگا - اسکو مطلق خبر نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے - کتنے جدید علوم و

فنون رائج ہو چکے ہیں اور آئندہ کیا ہونیوالا ہے، وہ اپنے حجرہ میں پڑا ہوا، لانبی داڑھی پر ہاتھ پھیر پھیر کر جنت اور حور ان جنت کے خواب دیکھا کرتا ہے۔ اور اسے اُن "جنات عدن" کا کوئی حال معلوم نہیں جو اس دُنیا میں دوسری قوموں نے اپنے لئے پیدا کرلی ہیں۔ جس وقت وہ لذیذ غذائیں کھانے کے بعد ڈکاریں لے لیکر الحمد للہ کہتا ہے تو ایسا محسوس کرتا ہے گویا خدا اسکی اس ادائے عبودیت پر نہایت مسرور ہے۔ اور اسے بالکل پرواہ نہیں اگر خود اس کے متعلقین فاقہ میں مبتلا ہیں۔ الغرض وہ ان درسگاہوں سے تعلیم پانے کے بعد ایک ایسا خود غرض، نفس پرست، بلید الذہن، ماؤف الدماغ، تنگ نظر اور تنگ حوصلہ شخص ہو کر نکلتا ہے۔ جس کے لئے نہ نظام تمدن میں کوئی جگہ ہے اور نہ عالم اخلاق میں۔ وہ اپنی فقہی و روایتی معلومات سے مدد لیکر دُنیا میں ہر ظلم کے لئے تیار رہتا ہے اور مذہب کی آڑ پکڑ کر وہ انسانیت کو داغدار کرنے سے کبھی باز نہیں رہتا۔

یہیں لکھنؤ سے قریب ضلع بارہ بنکی میں ایک مشہور قصبہ ہے۔ جہاں بہت سے تعلقہ دار بھی رہتے ہیں، اور بعض خاندان مذہبی علماء کے بھی ہیں، ایک صاحب ثروت پختہ عمر کی بیوہ خاتون جو کافی متمول ہیں۔ حج کے لئے جانا چاہتی تھیں۔ لیکن چونکہ کوئی محرم موجود نہ تھا اس لئے پس و پیش میں تھیں کہ کیا کرنا چاہیے۔ انہوں نے اپنی اس مشکل کو قصبہ کے ایک "مولانا" کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ "بہ حالات موجودہ جبکہ کوئی محرم آپ کی معیت کے لئے موجود نہیں۔ آپ کا حج کے لئے جانا یقیناً درست نہیں۔ مگر ایک صورت ایسی پیدا ہو سکتی ہے کہ میں آپ کے ساتھ چلا چلوں۔"

خاتون یہ سنکر خوش ہو گئیں۔ کیونکہ مولانا سے زیادہ مقدس و محترم ساتھی اور دوسرا کون ہو سکتا تھا۔ اس نے کہا کہ ارشاد ہو وہ کیا تدبیر ہے؟ انہوں نے کہا کہ "میرے دو چھوٹے بچے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ میں تمہارا نکاح بہ حیثیت ولی ہونے کے پڑھائے دیتا ہوں۔ اور اس طرح میں تمہارا محرم ہو جاؤں گا۔" اس غریب نے اس شرط کو منظور کر لیا اور کچھ نقد روپیہ بھی ان کے حوالہ کر کے حج کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔

جب اس خاتون کے اعزا کو یہ حال معلوم ہوا تو انہوں نے کہا کہ یہ تم نے کیا کیا۔ تمہارے خاوند کی یہ وصیت ہے کہ دوسرا نکاح کرنے کی صورت میں تم تمام جائداد سے محروم ہو جاؤ گی۔ یہ سنکر وہ بہت پریشان ہوئیں اور مولانا کے پاس جا کر کہا کہ میرا ارادہ اب حج کا نہیں ہے۔ اس لئے امانت کی رقم واپس کر دیجئے اور اس نکاح کے قصہ کو بھی ختم کیجئے۔ کیونکہ اس سے مقصود تو صرف آپ کو محرم بنانا تھا اور اس کی اب ضرورت باقی نہیں رہی۔

مولانا نے یہ سنکر روپیہ تو خیر واپس کر دیا کیونکہ وہ ہضم نہ کر سکتے تھے۔ لیکن نکاح کے بارہ میں جو جواب دیا ہے وہ سننے کے قابل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ "میں بہ حیثیت ولی ہونے کے کسی نابالغ کی طرف سے کوئی چیز حاصل تو کر سکتا ہوں لیکن اس کو واپس دینے کا مجاز نہیں ہوں۔ اب تو جب لڑکا بالغ ہوگا اسوقت اسے اختیار ہوگا۔ خواہ آپ کو طلاق دے یا آپ کو لا کر گھر میں رکھے۔"

یہ ہے وہ ذہنیت جو مذہبی تعلیم سے پیدا ہو جاتی ہے اور یہ ہے وہ غلط استعمال فقہ و مذہب کا جسکی مثالیں بکثرت مولویوں کی زندگی میں نظر آتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس وقت جتنے علماء مذہب ہیں وہ سب اسی گمراہ ذہنیت کے ہیں۔ لیکن جو چند اچھے اخلاق کے ہیں۔ وہ یقیناً وہی ہیں جو فطرتاً حد درجہ نیک پیدا ہوئے ہیں اور جو اس سے زیادہ مفید ثابت ہوتے اگر اس ماحول میں ان کی تعلیم و تربیت نہ ہوتی۔

عالم تمدن میں سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ باہمدگر جذبۂ اخوت کا پیدا ہونا ہے اور ایک دوسرے کیساتھ ہمدردی کرنا۔ لیکن ایک ایسے شخص میں جس نے کسی مذہبی درسگاہ میں تعلیم پائی ہے۔ سب سے پہلے یہی جذبہ فنا ہوتا ہے کیونکہ وہ سوائے اپنی جماعت کے باقی تمام نوع انسانی کو گمراہ دخاطی۔ باغی و کافر سمجھتا ہے۔ اور یہ ناممکن ہے کہ اس جذبہ کے ساتھ ساتھ نفرت و مغائرت کی کیفیت دل میں پیدا نہ ہو۔ ایک پابند مذہب شخص کسی دوسرے کو انسان دیکھنے سے قبل یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ اسکا ہم عقیدہ و ہم خیال ہے یا نہیں اور اگر نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کا مقہور و مردود بندہ ہے اور کسی طرح ہمدردی و محبت کا اہل نہیں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ دیگر مذاہب کے علماء کا کیا حال ہے۔ لیکن کم از کم مسلمانوں میں یہ عیب ضرور پایا جاتا ہے۔ اور وہ سوائے اپنے کسی اور کو نجات کا مستحق سمجھتے ہی نہیں۔ یہ تو رنگ ہے ان کے اخلاق و روحانیت کا۔ اب اسی کیساتھ آپ اس پر بھی غور کیجئے کہ دنیا کے کاروبار میں، سوسائٹی میں اور عملی میدان میں ان کی اہلیت کیا ہے۔ جن لوگوں کو اس جماعت کے افراد سے واسطہ پڑا ہے ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ ان کا دماغ کوئی صحیح بات سوچ سکتا ہے اور نہ وہ اسے اپنی زبان سے ادا کر سکتے ہیں۔ نہ وہ کسی مہذب و شائستہ سوسائٹی میں بیٹھ کر تبادلۂ خیال کر سکتے ہیں اور نہ کسی معاملہ کا اہتمام و انصرام اُن کے بس کی بات ہے۔ وہ ہر چیز کو موت اور مابعد الطبیعیات کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور ہر کام کو خدا کے سپرد کر کے اپنے ہاتھ پاؤں ہلانا غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ دنیاوی زندگی غیر حقیقی زندگی ہے اور اصل حیات موت کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اور یہ چند روزہ زندگی عسرت و افلاس۔ نکبت و ذلت۔ بے سروسامانی میں بسر ہو تو بھی کیا پرواہ ہے۔ وہاں تو ان کے لئے آرام ہی آرام مقسوم ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ جس قوم کے خیالات و عقائد یہ ہونگے وہ خاک کوئی کام دنیا میں کر سکتی ہے اور اس میں ترقی کرنے کی صلاحیت پیدا ہونا کیونکر ممکن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسوقت ہندوستان میں چند علماء مذہب ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو اپنے خیالات و اقوال کے لحاظ سے اتنے پست و فرومایہ نہیں ہیں۔ لیکن عملی حیثیت سے وہ بھی بیکار ہیں اور افراد قوم کی ایسی رہنمائی کرنا جو واقعی ان کے درد کا علاج ہو سکے ان کے امکان سے باہر ہے۔ یہ لوگ جس وقت وعظ و تقریر کیلئے کھڑے ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوہ ہمالہ کو بھی اپنی جگہ سے سرکا دیں گے۔ لیکن جب وہ ڈائیس سے اتر کر نیچے آتے ہیں تو وہ پرکاہ کو بھی جنبش دینے کا اقدام نہیں کرتے۔

اس لئے غور طلب امر یہ ہے کہ اس وقت جو لاکھوں روپیہ مذہبی درسگاہوں پر صرف ہو رہا ہے۔ اسے ملک و قوم

کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے - اور اس وقت تک جو کچھ صرف ہو چکا ہے اسکا کیا نتیجہ نکلا ہے - ممکن ہے کہ یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ آخرت میں حوروں کے کام آسکیں - یا جنت کے اس وسیع خلاء کو پُر کر سکیں جہاں سوائے مولویوں اور مولوی پرستوں کے کسی اور کی گنجائش نہیں ہے - لیکن سوال یہ ہے کہ جنت یا حوروں کے لئے یہ پیداوار "ملک معظم" کے سکہ سے کیوں فراہم کی جائے - ایک کافر بادشاہ کے روپیہ سے عاقبت سنوارنا کیا معنی؟ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ یہ روپیہ فرمانروائے وقت کا نہیں بلکہ انھیں کا ہے جو اس کار خیر کے لئے دیتے ہیں - تو پھر یہ بتایا جائے کہ اس وقت تک مسلمانوں کی جماعت کو ان درسگاہوں سے کیا فائدہ پہنچا ہے - خیر دنیا کو چھوڑئیے - دین ہی کا کوئی فائدہ بتایا جائے - مادی ترقی نہیں کوئی اخلاقی و روحانی ہی ترقی ایسی پیش کی جائے جو ان مدارس کے ذریعہ سے دنیا میں اشاعت پذیر ہوئی - کتنے گمراہ اُن کی پند و موعظت سے راہ راست پر آئے، کتنے مندر و کلیسا انہوں نے مسجدوں میں تبدیل کئے -

مسلمانوں کے علاوہ اور مذہبی اقوام میں بھی علماء تیار کئے جاتے ہیں - لیکن نہ اُن پر اتنا مذہبی جنون سوار ہوتا ہے اور نہ بلحاظ علم وفضل وہ اتنے تنک مایہ ہوتے ہیں - مثلاً انگریزی مشنریوں کو لیجئے اور دیکھئے کہ ذہن وعمل دونوں حیثیتوں سے وہ کتنے ممتاز ہوتے ہیں - ان کے اخلاق کا یہ عالم ہے کہ اُن سے بات کرنا گویا ان کا گرویدہ ہو جانا ہے - ان کی قوتِ عمل وسلیقۂ تنظیم کی یہ کیفیت ہے کہ ایک ایک شخص نے نئے نئے مستعمرات تیار کر کے رکھ دیئے - اور جس کو عیسائی بنایا اسکی معیشت ومعاشرت میں تغیر پیدا کر کے رکھ دیا - رہ گیا علم وفضل سو اُس کا یہ رنگ ہے کہ جب تک تمام علوم مروجہ میں کمال حاصل نہ ہو جائے ان کا اس خدمت کیلئے انتخاب ہو ہی نہیں سکتا - اور اس طرف جو کیفیت ہے اسکا حال بارہا صفحات "نگار" پر آچکا ہے - اور جن کو اس جماعت کے مطالعہ کا فخر حاصل ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ "خرقۂ پشمینہ طلائیم مو بافت است" - ہمارے علماء اپنے آپ کو ہمارا رہبر ظاہر کرتے ہیں اور ہماری دینی ودنیوی بہبود کے ذمہ دار ہیں اور ان کو ایسا ہونا چاہئے کیونکہ وہ شریعت نبوی کے ماہر، اسوۂ رسول کے پابند اور جانشین پیمبر ہیں - لیکن جس وقت ہم مسلمانوں کے موجودہ تدریجی انحطاط وزوال پر غور کرتے ہیں تو ہم کو کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ ہمارے علماء مذہب نے حقیقتاً کسی اسوۂ نبوی کا اظہار کیا ہو - یا کوئی کام ایسا کیا ہو جو قوم کی حالت کو سنبھالنے والا ہو -

انجمن خلافت کا جو حشر ہوا ظاہر ہے، کہ لاکھوں روپیہ مسلمانوں سے وصول کیا گیا اور قوم کے کسی ایک فرد کو بھی اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچ سکا - اسی طرح تبلیغ کے نام سے بیشمار روپیہ تمام اکناف ہند سے فراہم کیا گیا - لیکن مسلمانوں کو بھی اس سے مسلمان نہ بنایا جا سکا - غیر مسلموں یا کافروں کا کیا ذکر ہے - پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر ہمارے رہنما اس قدر غافل وخود غرض واقع ہوئے ہیں تو ہم کیوں اتنے احمق و بیوقوف ہیں کہ باوجود اتنے تجربات کے ہنوز ان پر اعتماد کیا جاتا ہے اور اپنی حالت سنبھالنے کے لئے ہم ان کے مشورہ کے منتظر ہیں -

اس وقت مسلمانوں کے سامنے سوال نہ عربی تعلیم کا ہے نہ مسائل شریعت سمجھنے کا - نہ روزہ ونماز کے حفظ ارکان کا ہے -

نہ فریضۂ حج کے ادا کرنیکا - بلکہ صرف اس بات کا کہ وہ دُنیا کی اس جدید کشاکش میں زندہ کیونکر رہے - اور قوم کے ۵۰ فیصدی فاقہ کرنیوالوں کا پیٹ کس چیز سے بھرے - نمازیں پڑھنے سے پہلے بھی کبھی رزق فراہم نہیں ہوا اور اب بھی نہیں ہو سکتا - روزہ رکھنے سے کشائیشِ رزق کا تجربہ نہ کبھی کامیاب ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے - اسیطرح فریضۂ حج ادا کرنے سے ہندوستان کے مسلمانوں کو کسی فائدہ کی توقع نہیں - پہلے اگر مسلمان یہ تمام فرائض شرعی ادا کرتے تھے تو صرف اس لئے کہ انھیں معلوم ہو سکے کون فرد ان کی جماعت کا ہے - انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ وہ نماز پڑھنے کے بعد ہاتھ پاؤں توڑ کر گھر میں بیٹھ رہے ہوں - وہ عبادت کرتے تھے محض اس لئے کہ ان میں ولولۂ عمل پیدا ہو - وہ خدا کے سامنے جھکتے تھے محض اس تمنّا میں کہ وہ دُنیا میں سر بلند ہو سکیں - جو ہاتھ نمازیں بندھتے تھے وہ تلوار اٹھانے کے لئے بھی ہر وقت کُھلے رہتے تھے - اور جو سر ایک بار بارگاہ ایزدی میں خم ہو جاتا تھا اس کے لئے کسی غیر کے سامنے جھکنا حرام ہو جاتا تھا -

سب سے پہلے اسلام ہی نے بتایا کہ آزادی انسان کا فطری حق ہے اور دُنیا میں وہی اوّلین مذہب تھا جس نے دین کو دُنیا سے ملا کر اس حقیقت سے عالم کو روشناس کیا کہ جس نے دُنیا میں اپنی آنکھ پھوڑ ڈالی ہیں وہ قیامت میں بھی اندھا ہی اٹھے گا - پھر جب تک مسلمانوں نے اس رمز کو سمجھا انہوں نے نئے نئے علوم و فنون کی بنیادیں ڈالیں - عمران و مدنیت کو اپنی تہذیب و شائستگی سے رونق دی - تاریخ عالم میں جدید ابواب کا اضافہ کیا - زمین کا قدیم جغرافیہ بدل دیا - خشکی و تری پر ہر جگہ ان کے قدم پہنچے اور خدا کے ان تمام انعام و برکات کو جو اس دُنیا میں انسان کے لئے پیدا کئے گئے تھے اپنے لئے مخصوص کر لیا - لیکن اب کہ اسلام نام رہ گیا صرف ان مسجدوں کا جو سچے نمازیوں سے خالی ہیں اور نماز مفہوم ہے ان سجدوں کا جو نشۂ سر بلندی سے معرا ہیں - ہمارا اپنے آپکو مسلمان کہنا حقیقتاً توہین ہے اسلام کی - تذلیل ہے رسول خدا کی اور ذلّت ہے انسان و انسانیت کی -

ہماری تمام درسگاہیں بیکار ہیں - ہمارے علماء بے مصرف ہیں اور جب تک ہم ان پر اعتماد ترک کر کے خود اپنے نفس پر اعتماد کرنا نہ سیکھیں گے - ہم کبھی فنا ہونے سے نہیں بچ سکتے - مولویوں کو چندہ دینا بند کر دو - مذہبی درسگاہوں کی اعانت سے ہاتھ کھینچ لو - کہ ان سے قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا - اگر تم ان درسگاہوں کو چلانا ہی چاہتے ہو تو ان کے اراکین سے دریافت کرو کہ تمہارے مدرسے کس مرض کی دوا ہیں - اور خود اپنے ہاتھ میں انتظام لیکر بچّوں کو وہ چیزیں سکھاؤ جو اس زندگی میں ان کے کام آنیوالی اور ان کے ذہن و عقل کو زمانہ کے دوش بدوش چلنے کا درس دینے والی ہیں -

---

تفسیر قرآن

(اُردو) پہلا حصہ مکّی سورتیں :- یہ تفسیر شانِ نزول اور کتب مقدسہ کی روشنی میں لکھی گئی - اور پادری جے - علی بخش ۳۵ گوالمنڈی لاہور سے بقیمت ایک روپیہ فی جلد مل سکتی ہے -

پارسی اہلِ کتاب ہیں

(مسلسل)

حضرت زرتشت پیغمبرِ برحق اور نبی مرسل تھے

زرتشتیوں کے موحد ہونے کی تصدیق اکثر علماء نے کی ہے۔[1] اور جس کی دلیل اس سے بڑھکر اور کیا ہو سکتی ہے کہ اُن کا خدا تمامی عالم کا خالق[2] کل انسانی افعال کا منصف[3] اور رحم و کرم کا سرچشمہ ہے۔[4] اور محض خدائے واحد ہی کی ذات اطاعت و فرمانبرداری کے لائق اور قابلِ پرستش ہے۔[5]

کل الہامی مذاہب کا اہم ترین اصول نیکی و پاکبازی ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق ژندواستا میں بڑے زور کیساتھ ہدایت کی گئی ہے اور مرقوم ہے کہ نیکی ہی مسرت کا باعث ہے اور یہی راہ امن و امان ہے۔ نیکی کو عزت کا لباس اور بدی کو شرم و ذلت کی پوشاک سے تشبیہ دی گئی ہے۔[6] ژندواستا میں لکھا ہے کہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ قابلِ قبول قربانی اور عبادت انسان کے افعال نیک ہیں۔ اور جن کی مقبولیت کے لئے نیت کا نیک ہونا بھی ضروری ہے۔ تمام خوبیوں کی بنا سچائی کو قرار دیا ہے۔ اور دروغگوئی کو سب سے بڑا اور ناقابلِ عفو گناہ بتلایا ہے۔ محنت اور جانفشانی کے متعلق لکھا ہے کہ ان کا ثمرہ ملنا لازمی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ ایمان کو تزلزل سے محفوظ رکھنے کے لئے محنت و مشقت ضروری چیز ہے۔ کاہلی انسان کی ذلت اور مفلسی کی

---

[1] قوانین حلم در دین زرتشت (مؤلفہ گوپر) دینیات زرتشتی (مؤلفہ ڈاکٹر دھالا) [2] تذکرہ پارسیان (مؤلفہ کارکا) انوار ایران پاستان (مؤلفہ پیتاوالا) [3] تذکرہ پارسیان اور قوانین حلم در دین زرتشت۔ ملاحظہ فرمائیے۔ [4] تذکرہ پارسیان اور قوانین حلم در دین زرتشت۔

[5] تذکرہ پارسیان صفحہ ۵۴ جلد دوئم۔

[6] دائرۃ المعارف دین و اخلاق۔ جلد دوازدہم۔ صفحہ ۸۶۵۔

باعث ہے۔ اسی طرح مہمان نوازی اور غربا پروری بھی اصولِ مذہب زرتشت میں داخل ہیں[1]

ان باتوں کو دیکھ کر بھلا کیونکر پیروانِ دینِ زرتشت منکرِ خدا یا کافر کہلانے کے مستحق ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ زمانہ موجودہ کے ایک مسلمان فاضل اس خصوص میں یوں اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہیں[2]

"عام طور پر جو لوگ آتش پرست مشہور ہیں ان میں نیکی وخیرات اور لین دین میں ایمانداری کی عادتیں عناصر فطرت کی پرستش سے ہرگز ہرگز پیدا نہیں ہوسکتی تھیں۔ انسان سے نیکی و شرافت کا ظہور اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے دل کو پاک وصاف رکھ کر خدائے قدوس کے وجود کا قائل ہوکر انوار الٰہی کا پرتو حاصل نہ کرلے۔ خداوند عالم ہی تمام مخلوق کا جس میں آتش کا بھی شمار ہے سرچشمہ اور خالق ہے۔ زرتشت ان ہی پیغمبروں میں سے تھے جو ربّ العالمین کی طرف سے مذہب کر بندوں کی ہدایت کے لئے دنیا میں ظہور کرتے رہے ہیں"۔

یہ امر یقینی ہے کہ باری تعالیٰ جو بہترین عادل اور مہر وکرم کا منبع ہے کسی شخص کے اعمال نیک کی جزا دیئے بغیر نہ رہیگا۔ چنانچہ خود قرآن حکیم میں مرقوم ہے کہ وہ لوگ جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے اور نیک کام کرتے ہیں وہ اپنے ربّ سے اسکا بدلہ پائیں گے اور ان کے لئے کوئی امر باعثِ خوف نہیں۔ اور وہ رنج نہ اٹھائیں گے[3]

خدا کی وحدانیت اور حشر کے دن نیک وبد اعمال کی جزا وسزا پانے پر ایمان رکھنے کی تعلیم جیسی کہ پیغمبرِ ایران حضرت زرتشت نے دی ہے وہ پارسیوں کی روزمرّہ زندگی میں بھی بخوبی آشکارا ہے۔ موجودہ پارسیوں کا اتقا اور ان کی شرافت اس کی بیّن دلیل ہے۔ چنانچہ ان باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر بلا پس وپیش اس امر کا اقرار کیا جاسکتا ہے کہ یہ قوم عقیدتاً موحد ہے اور ان کے پیغمبر بھی مثل دوسرے نبیوں کے سلطنتِ الٰہی کی بنیاد ڈالنے کے لئے مبعوث برسالت ہوئے تھے[4]

نیکی اور تقویٰ نام ہے پرہیزگاری کا۔ خدا۔ آخرت۔ فرشتے۔ انبیاء اور الہامی کتابوں پر ایمان رکھنے کا۔ خدا کی محبت میں فقراء۔ غربا۔ یتامیٰ کی اعانت وامداد کرنیکا۔ اور یہی عین عبادتِ الٰہی ہے۔ چنانچہ بلاشبہ یہی تعلیم زرتشتی بھی ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہر مذہب نے دنیا میں اپنے پیرؤں کو اسی راہ پر چلنے کا حکم دیا ہے۔ گو رفتار زمانہ نے اس قدر انقلابات ان کے اندر رونما کردیئے ہیں کہ آج ان کی اصلی شکل پہچاننی مشکل ہے۔ ورنہ تمام مختلف ادیان کا منبع اور سرچشمہ ایک ہی ہے اور کُل مذاہب مختلف اقوام وممالک کے لئے مختلف اوقات میں خدا کا ایک ہی پیغام لیکر آئے۔ باری تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں صاف طور پر فرمادیا ہے کہ "تحقیق ہم نے ہر قوم کے درمیان ایک ہادی ورہبر بھیجا اور جس نے خدا کی پیروی اور شیطان سے بیزاری کی تعلیم دی"[5] پھر ایک مسری

1۔ تذکرہ پارسیان صفحہ ۱۰۴ جلد دوئم۔ 2۔ اسلام اور دین زرتشت صفحہ ۲۱ (مولفہ مرحوم خواجہ کمال الدین)

3۔ سورۃ ۲ (آیہ ۶۲)۔ سورۃ ۵ (آیہ ۶۹) 4۔ دائرۃ المعارف امریکانی جلد شانزدہم (زرتشت)

5۔ سورۃ ۱۶ (آیہ ۳۶) قرآن مجید۔

جگہ ارشاد فرمایا کہ "ہم نے جس ملک میں بھی اپنا نبی بھیجا وہ وہاں کے لوگوں کی زبان لیکر مبعوث ہوا۔ تاکہ لوگوں کو خدا کا پیغام صاف طور پر سمجھا سکے[1]"

پاکیزہ خیالات۔ عمدہ اقوال۔ اور نیک اعمال ہی کی ترغیب ہر نبی کی جانب سے بنی نوع انسان کے لئے ہوا کی ہے۔ اور یہی باتیں ہر سچے مذہب کی جڑ ہیں۔ چنانچہ دین زرتشتی بھی ان ہی اصول کا پابند رہا۔ اس مذہب کے پیروؤں نے بھی عام اس سے کہ وہ کسی اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں یا ادنیٰ مرتبہ کے ہوں اپنے ہادی و رہبر کی تعلیمات کو اپنے دل و دماغ سے کبھی محو نہ کیا۔ اسکا نتیجہ آج بھی ظاہر ہے۔ اور پارسی قوم اپنے اعلیٰ اخلاق کے سبب اس وقت بھی آپ اپنی مثال ہے۔

پادری ہیچل اپنی ایک معروف کتاب میں کیش زرتشتی کے خصوصیات اس طرح گنواتے ہیں[2]:۔

(۱) یہ مذہب اپنے معبود کو کسی غیر مہذب صفت سے موصوف نہیں کرتا۔

(۲) کوئی غیر مہذب فعل اس دین کی عبادت میں شامل نہیں۔

(۳) اس کے کسی مذہبی رسم میں ظلم و بیدردی کا شائبہ نہیں پایا جاتا۔

(۴) نیکی و بدی کی جنگ میں زرتشتیوں کو نیکی کی معاونت کا حکم ہے۔

(۵) عورتوں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور کثرت ازدواج سے روکا جاتا ہے۔

(۶) کسی قسم کی بت پرستی اس مذہب میں داخل نہیں۔

(۷) پاکیزگی نفس اور اخلاق پر بڑا زور دیا گیا ہے۔

(۸) اوستا میں مستقبل کا ذکر اندوہگیں یا تاریک نہیں بلکہ انجام کار نیکی کی فتح مرقوم ہے۔

زنداستا کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات ہم پر اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ حضرت زرتشت کی تعلیم و اصلاح کا اصلی مقصد اس زمانہ کی پست ذہنیت اور توہم پرستی کا دور کرنا تھا تاکہ لوگ عناصر فطرت اور دیگر مخلوقات کی پرستش سے باز آجائیں[3]۔ زرتشت کے قبل بھی مختلف پیغمبروں نے لوگوں کے لئے ہدایت کے راستے کھولے تھے۔ مگر ان کی تعلیم تقریباً فراموش کی جاچکی تھی۔ سرزمین ہند کی طرح اس وقت ایران میں بھی دیوتاؤں اور معبودوں کی کثرت تھی۔ چنانچہ پیغمبر ایران نے صاف اعلان کردیا کہ سارے کے سارے دیوتا گروہ شیاطین سے متعلق ہیں اور اس لئے ہرگز لائق پرستش نہیں[4]۔ یہ اعلان ایرانیوں کے لئے جو خود بھی آریائی قوم کی ایک شاخ تھے اور دیوتاؤں کے پرستار۔ کچھ عجب نوعیت رکھتا تھا اور یہی سبب تھا کہ اول اول حضرت زرتشت کی سخت مخالفت کی گئی۔ مگر انجام کار لوگوں کو ایک سے زاید معبود کی پرستش سے باز رکھنے میں وہ کامیاب رہے اور اہورامزدا

---

[1] قرآن مجید۔ سورۃ ۱۴۔ آیہ ۴۔ [2] ہندوستان کے معروف مذاہب صفحہ ۱۶۲۔ [3] آئین پارسیان (مولفہ مولٹن)۔ میڈیا (مولفہ راگزین)۔ [4] مولفات ہاگ۔ مولٹن اور راگزین۔ ملاحظہ فرمایئے۔

(خدائے یکتا و دانا) کی عبادت اقلیم ایران میں ہمیشہ کے لئے رائج ہو گئی[1] زرتشت نے ایرانیوں کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ انسانی آنکھیں جمالِ باری کے دیکھنے سے معذور ہیں۔ اور ذاتِ معبودِ کُل مادّی علائق سے معرّا ہے۔ چنانچہ اس جگہ پر مناسب ہوگا اگر ہم اس خیال کی تطبیق ذیل کی آیتِ قرآنی سے بھی پیش کریں۔ خدا فرماتا ہے:۔

اللہ ہی تمہارا رب ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں۔ وہی خالق ہے۔ پس اسکی عبادت کرو۔
وہی سبکا کارساز ہے۔ آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں۔ مگر وہ سب کچھ دیکھتا ہے[2]

اب ذرا اوستائے مقدس میں بھی حضرت زرتشت کی تمثیل اس سلسلہ میں ملاحظہ ہو۔[3]

"اے مزدا جب میں نے دریائے فکر میں غوطہ لگایا تو محض تیری ذات کو ازلی و ابدی اور قابلِ پرستش پایا۔ تو ہی تمام پاکیزہ خیالات کا بانی اور حقانیت و سچائی کا خالق ہے۔ تیری ہی ہستی اعمالِ انسانی کی منصف ہے اور ان ہی خیالات پر قائم رہ کر میں تجھ پر ایمان لایا ہوں"

نوشیروان جی گوپرا اپنی کتاب "آئین علم در دینِ زرتشت" میں ایک مجوسی عالم (موبد) کی زبانی خدا کی تعریف یوں تحریر فرماتے ہیں:۔

"میں اس خدا پر ایمان رکھتا ہوں جو دونوں جہان کا خالق اور پاک یکتا ہے۔ نہ تو اس کی کوئی صورت (شبیہ) ہے اور نہ اسکا کوئی شریک۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا۔ خدا جسم و جسمانیت سے منزّہ ہے۔ وہ پاک پاکیزہ اور بے مثل و درخشندہ نور میں مستور ہے۔ اس کی تعریف کا حق کسی سے بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ فرشتے اس کے محکوم ہیں۔ وہ بڑی طاقت والا ہے۔ اور ہر جگہ موجود۔ خدا عادل ہے اور حکیم۔ وہی لائقِ پرستش اور مستحقِ عبادت و فرمانبرداری ہے۔"[4]

پارسیوں کے مذہبی ادبیات میں خدا کی صفات جو مرقوم ہیں۔ ان میں سے چند اس جگہ نقل کی جاتی ہیں:۔[5]

---

[1] مقالات ہگ۔ میڈیا۔ [2] سورۃ ۶ (آیۃ ۱۰۲) [3] یسنا۔ باب ۳۱۔ آیۃ ۸۔ [4] اس سلسلہ میں توحید کے متعلق اقوال جناب امیر المومنین علیہ السلام اور امام جعفر صادق بھی ملاحظہ ہو۔ (اصول کافی جلد دوئم۔ باب ۴-۲)

[5] ان کی مطابقت قرآن مجید میں بھی ملاحظہ ہو (سورۃ ۲۔ آیۃ ۱۴۶۔ اور ۲۵۶۔ سورۃ آیۃ ۷۷۔ سورۃ ۱۰۔ آیۃ ۱۰۵۔ اور ۱۰۷۔ سورۃ ۱۹۔ آیۃ ۴-۹-۹۱۔ سورۃ ۲۸۔ آیۃ ۸۸۔ سورۃ ۳۱۔ آیۃ ۱۲۔ سورۃ ۳۲۔ آیۃ ۶۵۔ سورۃ ۴۰۔ آیۃ ۶۲-۶۴)

اور بالکل اسی طرح توراۃ۔ سفر تثنیہ باب ۶۔ آیۃ ۴۔ سلاطین۔ کتاب اول۔ باب ۸۔ آیۃ ۲۳۔ تاریخ ایام کتاب اول باب ۱۷۔ آیۃ ۲۰۔ کتاب مزامیر باب ۸۶۔ آیۃ ۱۰۔ کتاب الاشعیا نبی۔ باب ۴۶۔ آیۃ ۹۔ کتاب ارمیا نبی۔ باب ۱۰۔ آیۃ ۶۔

اور انجیل مقدس ملاحظہ ہو۔ متی۔ باب ۴۔ آیۃ ۱۰۔ باب ۲۳۔ آیۃ ۹۔ مرقس باب ۱۲۔ آیۃ ۲۹۔ لوقا باب ۴۔ آیۃ ۸۔

وہ بزرگ ترین و برترین ہے۔ (یسنا۔ باب ۴۴۔ آیتہ ۷)

وہ بہترین ہے۔ (یسنا۔ باب ۲۶۔ آیتہ ۸)

وہ غیر منقلب ہے۔ (یسنا۔ باب ۳۱۔ آیتہ ۷)

وہ تمام چیزوں کا خالق ہے۔ (یسنا۔ باب ۴۵۔ آیتہ ۶)

اُس کے قبل کچھ بھی نہ تھا۔ (یسنا۔ باب ۲۸۔ آیتہ ۳)

وہ تمام عالم کا پیدا کرنے والا ہے۔ (یسنا۔ باب ۵۰۔ آیتہ ۱۱)

وہ انسانی ارواح و ضمایر کا خالق ہے۔ (یسنا۔ باب ۳۱۔ آیتہ ۱۱)

وہ رحیم ہے۔ (یسنا۔ باب ۲۸۔ آیتہ ۵)

اُس نے پانی۔ درخت اور کُل دوسری چیزوں کو پیدا کیا۔ (یسنا۔ باب ۵۱۔ آیتہ ۷)

وہ خود مختار ہے۔ (یسنا باب ۴۳۔ آیتہ ۱)

وہ تمام ہستیوں کا مالک ہے۔ (یسنا باب ۲۸۔ آیتہ ۷)

وہ عاقل ہے۔ (یسنا۔ باب ۲۹۔ آیتہ ۶)

وہ سب کچھ جانتا ہے۔ (یسنا۔ باب ۴۶۔ آیتہ 19)

وہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ (یسنا۔ باب ۳۳۔ آیتہ ۱۳)

کوئی اُسے دھوکا نہیں دے سکتا۔ (یسنا۔ باب ۴۳۔ آیتہ ۶)

وہ تمام رازوں کا جاننے والا ہے۔ (یسنا۔ باب ۳۱۔ آیتہ ۱۳)

وہ کُل باتوں سے واقف ہے۔ (یسنا۔ باب ۳۱۔ آیتہ ۵)

وہ پاکیزگی کا منبع ہے۔ (یسنا۔ باب ۴۳۔ آیتہ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۷)

اُس کی سلطنت میں رحم و کرم کی بہتات ہے۔ (یسنا۔ باب ۵۱۔ آیتہ ۴)

وہ پاکیزہ ترین ہستی ہے۔ (یسنا۔ باب ۴۴۔ آیتہ ۷)

وہ حکیم۔ رحیم۔ با اختیار اور عادل ہے۔ (یشت ۔ ۱۔ ۷۔ ۱۲۔ ۱۴۔ ۱۵)

اُسی کی حکمت اس مادی دُنیا کی تخلیق کا باعث ہوئی۔ جسے وہ خود اپنی مرضی سے ختم کر دیگا۔ (یشت ۱۔ ۲۶)

اس کے علاوہ پارسیوں کی عبادت روزمرہ کی کتاب خوردہ اوستا میں خداوند کریم کی دیگر صفات حسنہ کا ذکر ہے۔ جو تمامتر قرآن مجید کے مرقومہ صفاتِ الٰہی سے مطابق ہے۔ غرضکہ پارسیوں کے اعتقاد میں خدا ہی سب سے اعلیٰ اور برتر ہستی ہے۔ اور وہی تمام آفرینش کا باعث۔ نہ تو وہ کسی شے سے پیدا ہوا اور نہ اُس کے جیسی کوئی شے ہو سکتی ہے وہ لاتعداد صفات کا

ملہ دینیات زرتشتی۔ صفحہ 19 (مؤلفہ ڈاکٹر دھالا)

حامل ہے۔ جو اس کی ذات سے وابستہ اور اسکا عین جزو ہیں[1]

پیغمبر ایران نے قطعی طور پر عناصر فطرت اور مصنوعات کی پرستش ممنوع قرار دیدی تھی۔ چنانچہ اپنے ہادی و رہبر کی ہدایات کے مطابق زرتشتی گروہ نے ہمیشہ اپنے تئیں بت پرستی سے علیحدہ رکھا۔ اور اُسے ایسا گناہِ عظیم سمجھا کہ ان کے معبدگاہ مطلقاً بتوں سے بے بہرہ رہے ہیں[2] ہیروڈوٹس مشہور یونانی مورخ جسکا زمانہ ساڑھے چار سو برس قبل مسیح گذرا ہے۔ ایک جگہ یوں رقمطراز ہے:۔[3]

"ایرانی مجوسیوں نے کبھی اصنام پرستی نہیں کی۔ بلکہ ایران کے بہادر ہمیشہ بت پرستوں سے برسر پیکار رہے۔ اور ان کے صنم‌کدوں کو خاک میں ملانے کی کوشش جاری رکھی"۔[4]

اقوام ہنود کی بت پرستی سے قطع نظر کہ جن کے دین آبائی نے ہزاروں سال کے اندر بڑے بڑے انقلابات کا سامنا کیا ہم دیکھتے ہیں کہ خود وہ مذاہب جو آسمانی صحیفوں کے حامل یا کسی کتاب اللہ سے منسلک رہ کر فخر و مباہات کرتے ہیں۔ ان کے پیروؤں نے بھی ایک حد تک بت پرستی سے تعلق ضرور رکھا ہے۔ موسائیوں نے اپنے برگزیدہ پیغمبر کی زندگی ہی میں گوسالہ پرستی کی تھی[5] اور موجودہ زمانہ میں تو عیسائیوں کی ایک بڑی تعداد حضرت مسیح۔ کنواری مریم اور بہتیرے اولیاء کے بتوں کی پرستش نہایت جوش و خروش کیساتھ اب تک کیا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر فارنل ایک مغربی عالم فرماتے ہیں کہ دین عیسوی کی تاریخ اس خصوص میں حد درجہ افسوسناک ہے۔ قبل میں تو ایک مدت تک عبادت گاہیں اصول موسوی کی پابند رہیں مگر بہت جلد ہی رومی و یونانی جذبات صنم پرستی نے حضرت موسیٰ کی روحانی تعلیم پر غلبہ حاصل کرلیا۔ چنانچہ آج کل دنیائے مسیحیت باستثنائے چند افراد یوروپین پروٹسٹنٹ بت پرستی میں مبتلا ہے[6]

حضرت زرتشت نے ایسے زمانہ میں اپنی تبلیغ شروع کی تھی جبکہ ملک کے لوگ تہذیب و تمدن سے تقریباً ناواقف تھے[7] اُن کی تعلیم کی حقیقت اور اُن کے اصول ہدایت ہی سے اُن کے وجدان اور معرفت الٰہی کا پتہ چلتا ہے۔ جو درحقیقت کافی غور و فکر اور فلسفیانہ تخیل کا نتیجہ تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ بالکل یہی معاملہ ہر نبی اور پیغمبر کے ساتھ پیش آیا۔ کسی نے بھی اُس وقت تک راہ ہدایت کی تبلیغ پر کمر ہمت نہ باندھی جب تک کہ اُسے الہامی طور پر اس بات کا یقین نہ ہوگیا کہ حقیقتاً وہ معلم بزرگ و برتر کی جانب سے براہ راست اس اہم کام کے لئے مقرر ہوا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ہمارے کل انبیائے سلف بھی مثل ہمارے

---

[1] دینیات زرتشتی صـ۲۰ (مؤلفہ ڈاکٹر دھالا) [2] تاریخ ایران مؤلفہ مارخم صـ۲۲ ۔ [3] تاریخ قدیم (کیمبرج سیریز) جلد ۴۔ صـ۲۵ اور مقالات ہاگ۔ [4] دینیات زرتشتی (مؤلفہ دھالا) صـ۸۱ ۔ [5] قرآن مجید۔ سورۃ ۲۔ آیہ ۵۱۔
[6] اوصاف خداوندی۔ صـ۳۶ ۔ [7] تاریخ قدیم (کیمبرج سیریز) جلد ۴۔ صـ۲۷۔ میڈیا (مؤلفہ راگزین) اشعار دینی ایران باستان (مؤلفہ مولٹن)۔ مقالات ہاگ۔ ملاحظہ ہو۔

افراد مخلوق ہی تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ "ہم نے (اے محمد صلعم) تم سے قبل اپنے رسول بھیجے اور انھیں بھی عیال و اطفال سے سرفراز کیا۔ لیکن کوئی نبی بغیر ہماری اجازت کے کوئی پیغام نہیں لایا"۔ [۱]

لازمی ہے کہ ہم جو کچھ کہیں، یا کریں ذرا اپنی عقل سے بھی کام لیکر۔ زرتشت جیسی شخصیت کی نبوت یا اُن کی تعلیم کے متعلق کوئی خیال ظاہر کرنے سے پیشتر ضروری ہے کہ کچھ تحقیق بھی کر لیں۔ چنانچہ خود کلامِ الٰہی میں بار بار اس کی تاکید کر دی گئی ہے۔ "ہم نے کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا جسے ہماری طرف سے الہام نہ ہوا ہو۔ اگر نہیں جانتے ہو تو عالموں سے پوچھو"۔ [۲]

اسی بناء پر خواجہ کمال الدین مرحوم نے نہایت بجا و درست فرمایا تھا کہ حضرت زرتشت صحیح معنوں میں خدا کے بھیجے ہوئے رسول تھے۔ [۳]

اگر ہم تمام مذاہب اور اُن کے معلمین کی سچی تعلیمات پر غور و انصاف کی نظر ڈالیں تو معلوم ہو جائیگا کہ ہر مذہب کا اصلی مقصد محض اسی قدر تھا کہ چند ایسے اصول و قوانین کی اتباع پر اپنے گروہ کو مجبور کرے جو پسندیدہ خصائل کی تحریک میں معاون ہوں۔ اور ہر نبی کی یہی تعلیم رہی ہے کہ لوگ خدائے واحد کی پرستش کریں۔ جو خالقِ کلّ موجودات ہے۔ دُنیا میں امن و سکون قائم رکھنے کی کوشش کریں۔ کہ مقصدِ آفرینش یہی ہے۔ اسی کا نام اسلام ہے۔ محمد عربی صلعم نے کسی نئے دین کی ترویج نہیں فرمائی۔ وہ تو اُسی پرانے مذہب کی اصلاح اور تجدید کے لئے مبعوث برسالت ہوئے جس کی نوح۔ داؤد۔ ابراہیم۔ موسیٰ۔ عیسیٰ وغیرہ نے اپنے اپنے زمانہ میں تعلیم دی تھی۔ اکثر انبیاء کے نام سے ہم واقف ہیں اور اکثر کو نہیں جانتے۔ [۴]

چنانچہ قرآن حکیم میں ہمارے نبی سے خطاب ہوتا ہے:۔

"ہم نے تم پر اپنی کتاب محض اس واسطے نازل کی ہے کہ تم تمام اختلافی مسائل کو طے کر دو۔ اور لوگوں کیلئے ہادی اور رحمۃ للعالمین بن جاؤ"۔ [۵] پھر ارشاد ہوتا ہے۔ "تحقیق کہ ہم نے تمھیں سچائی کے ساتھ بھیجا ہے۔ تم لوگوں کو خوشخبری پہنچانے والے اور ڈرانے والے ہو۔ دُنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس کے درمیان ہم نے اپنی طرف سے کوئی سمجھانے والا نہ بھیجا ہو"۔ [۶]

پس ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہر مذہب اور ہر دین کی اصلی غرض محض ایک ہی تھی۔ حالانکہ ان مذاہب کی ترویج مختلف اوقات اور مختلف مقامات میں ہوئی۔ اس جگہ مناسب ہوگا اگر ہم سر سید احمد اعلی اللہ مقامہٗ کے ایک مشہور خطبہ

---

[۱] سورۃ ۱۳۔ آیۃ ۳۸۔ [۲] سورۃ ۱۶۔ آیۃ ۴۳۔ [۳] اسلام و دینِ زرتشت۔ صـ ۳۵۔

[۴] قرآن۔ سورۃ ۴۔ آیۃ ۱۵۸ [۵] سورۃ ۱۶۔ آیۃ ۶۳۔ [۶] سورۃ ۳۵۔ آیۃ ۴۴۔

اس سلسلہ میں کتاب "النبوۃ والخلافت" مصنفہ شمس العلماء سید نجم الحسن صاحب ملاحظ فرمائیے۔ موصوف نے نبوت کے معنی اور لوازمات نبوت پر وضاحت کے ساتھ بحث فرمائی ہے۔

جس میں انہوں نے اسلام سے بحث فرمائی ہے۔ مختصر اقتباس ہدیۂ ناظرین کریں۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"وہ چیز جس پر یقین کرنے سے کوئی شخص مسلم یا مسلمان کہا جا سکتا ہے۔ وہ خدا کی توحید ہے۔ جو شخص خدا کو برحق جانتا ہے اور اس کی توحید پر یقین رکھتا ہے وہ مسلم یا مسلمان ہے۔ یہی رکن اول اور رکن اعظم اسلام کا ہے۔ اور باقی ارکان اس کے تحت میں اور اس کے ساتھ اس طرح ملے ہوئے ہیں جیسے کہ کسی خالص دوا کی معجون ہو اور اس کے ساتھ اور اجزاء بھی ملے ہوئے ہوں۔ خدا کو واحدِ مطلق اور خالق تمام چیزوں کا جاننا اور سمجھنا بلکہ نہ صرف جاننا اور سمجھنا بلکہ اس پر یقین ہونا اسلام ہے۔ اور جو اس پر یقین کرے وہ مسلم ہے۔ خدائے تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہود و نصاریٰ کی نسبت اس کا ذکر فرمایا ہے۔ جس نے خدا پر یقین کیا اور اپنا منہ خدا کے سامنے کیا اور نیک کام کرتا ہے۔ اسکا اجر خدا کے پاس ہے[1] خدا نے اہلِ کتاب سے اور کچھ نہیں چاہا۔ بجز اس کے کہ خدا کی توحید مانیں اور اسکی عبادت کریں۔ (اے اہلِ کتاب آؤ اور ہم تم صلح کرلیں کہ ہم سوائے اللہ کے اور کسی کی عبادت نہ کرینگے۔)[2] پھر ایک جگہ خدا نے فرمایا ہے کہ ابراہیم نہ یہودی تھا اور نہ نصرانی۔ بلکہ ٹھیٹ مسلمان تھا۔[3] پس جو حقیقت اسلام کی خدا نے بتلائی وہ خدا کو ماننا اور اس پر یقین ہونا ہے۔ خدا پر اور خدا کی وحدانیت پر اس وقت یقین ہو سکتا ہے جب اسکی ذات و صفات پر جو حقیقت میں متحد ہیں اور اس کے استحقاق عبادت پر جو اُسکو لازم ہے پورا پورا یقین ہو۔ اس کی ذات پر یقین اس کے موجود بالذات ازلی و ابدی۔ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہونے پر یقین ہونا ہے۔ اُس کی صفات پر یقین اُس کی مانند صفات کسی دوسرے میں نہ ہونے پر یقین کرنا ہے .... اُس کے استحقاق عبادت پر یقین یہ ہے کہ کوئی شئے سوائے خدا کے مستحق عبادت نہیں یعنی عبادت کے لائق نہیں۔ جو شخص کہ اس طرح سے خدا پر یقین رکھتا ہے وہ مسلمان ہے میں نہیں کہتا بلکہ خدا نے یونہی کہا ہے۔ ہاں ایسے شخص کو جو محض خدائے واحد کو مانتا ہے میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ محمدی نہیں۔ قرآن کی اصطلاح تو یہی ہے جو میں نے بیان کی۔ مگر ہمارے زمانہ میں محمدی اور مسلمان کے الفاظ ایک ہی معنی میں لئے جاتے ہیں۔ اور مترادف سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے مجھ کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ محمدی ہونے کیلئے ضرور ہے کہ ہم اُس شخص پر بھی جس نے ہم کو توحید کی نعمت دی اور جس نے ہم کو توحید کی تعلیم کی اور جس کی وجہ سے ہم نے خدا کو جانا۔ اور اس کی صفات کو پہچانا یقین کریں ...."[4]

بہرکیف اب یہ سمجھ سکتے ہیں کہ محض اسی ذات کی جسے ہم خدا کہتے ہیں پرستش ہر مذہب کے رکن اعظم ہونا چاہئے۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ طریقۂ پرستش اور عبادت جداگانہ اور مختلف ہو۔ اکثر تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی مذہب کے مختلف گروہ اور جماعت میں طریقۂ عبادت اور پرستش میں نمایاں اختلاف نظر آتا ہے۔ مگر باوجود اس فروعی اختلاف کے ہم انھیں اسی

---

[1] سورۃ ۲۔ آیۃ ۱۱۲۔ [2] قرآن۔ سورۃ ۳۔ آیۃ ۶۳۔ [3] قرآن۔ سورۃ ۳۔ آیۃ ۶۶۔
[4] مجموعہ لیکچرز سر سید احمد خاں۔ مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۰۰ء صفحہ ۲۸۸۔

مذہب کے پیروؤں میں شمار کرتے ہیں۔ ہر شخص خدا کو پہچاننے کے لئے اس کی کسی مخلوق ہی کو ذریعہ قرار دیتا ہے۔ یعنی اُس کی قدرت سے موثر ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ مذہب زرتشتی کو بھی بُت پرست مذاہب میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ وہ آتش پرستی کی تعلیم دیتا ہے انصاف پر سخت ظلم کرنا ہے [1] ڈاکٹر مولٹن نے اپنی ایک کتاب میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان کا اس جگہ پر ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے [2] وہ فرماتے ہیں:۔

"پارسی جو آگ کیساتھ احترام و ارادت کا اظہار کرتے ہیں۔ اسے لفظ عبادت و پرستش سے یاد کرنا سخت نادانی ہے۔ اگر اس سے ناسمجھ حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ وہ لوگ آگ کو خدا جانتے ہیں تو یہ ان کی سراسر غلطی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اس مذہب کے پیروؤں میں چند جہلا ایسے بھی ہوں جو اس طریقۂ احترام کو عبادت سمجھیں مگر پڑھے لکھے اور سمجھدار پارسی کا ایمان صرف ایک خدا کی عبادت کرنا ہے۔ اگر وہ فرشتوں کا احترام کرتا ہے تو وہ بھی محض اس خیال سے کہ اُن کے ذریعہ اُسے خدا تک پہنچنے کی راہ ملتی ہے۔"

ہمارے ہم مذہب حضرات ہماری اس جرأت کو معاف فرمائیں۔ اگر ہم انھیں بھی خود ان کے غلط فہمی پیدا کرنیوالے طریقوں کی طرف متوجہ کریں۔ مسلمانوں کا سنگِ اسود کو ایام حج میں بوسہ دینا ایک اجنبی کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرسکتا ہے۔ کہ وہ پتھر پوجتے ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ مراسم حج ادا کرتے ہوئے اگر ہم حجرِ اسود کا احترام ظاہر بظاہر بھی بجالاتے ہیں تو یہ ہرگز کسی طور بھی پرستش کا شائبہ نہیں رکھتا۔ اسی طرح کعبہ کے رخ نماز پڑھنی کعبہ پرستی نہیں کہلاسکتی۔ بس یہی حال ان پارسیوں کا ہے۔ وہ آگ کا احترام محض اس لئے کرتے ہیں کہ اس کی روشنی خدائی تجلّی یا انوار الٰہی کا خیال اُن کے دلوں میں پیدا کرتی ہے اور بلاشبہ آگ یا روشنی کا احترام کوئی نیا طریقہ یا غیر معمولی جذبہ نہیں ہے [3] عناصر فطرت میں آتش کو ابتدائے آفرینش سے ایک امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہانتک کہ روشنی یعنی نور کو خدا کی خلق کی ہوئی کُل اشیاء پر ترجیح ہے [4] اس دُنیا میں تمام مادی چیزوں کی بنا بعض علماء کے نزدیک آگ اور اسکی گرمی ہی ہے۔ چنانچہ جب یہی حقیقت زرتشتیوں پر بھی ظاہر ہوچکی کہ آگ اور روشنی خداوند کریم کی قدرت کے سلسلہ میں بہترین اور بزرگ ترین مظہر ہے۔ تو انہوں نے بھی خالق کون و مکاں کو پہچاننے کا ذریعہ اسی اعلیٰ ترین عنصرِ فطرت کو بنایا۔ اسی آگ سے وہ باری تعالیٰ کی قدرت و حکمت کا صحیح اندازہ کرسکے [5] ان کے اس خیال کو ہرگز ہم لچر اور پوچ یا غیر منطقی نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ خود قرآن مجید۔ توراۃ و انجیل

---

[1] میڈیا در اگزین، مقالات ہاگ۔ اور اشعار دینِ ایران باستان۔ [2] گنجینۂ معان ص ۱۴۷ (مؤلفہ مولٹن)

[3] ۔ کتاب عقائد عالم (مؤلفہ جیمس گارڈنر) میں بالتفصیل درج ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے مذہبی ادبیات کے مطابق آگ ہی خدا کی نشانی کا کام دے سکتی ہے۔ ملاحظہ ہو جلد اوّل۔ [4] عقائد عالم (مؤلفہ گارڈنر) جلد اوّل۔

[5] ۔ دینیات زرتشتی (مؤلفہ دھالا) اور تصنیفات ڈاکٹر مولٹن ملاحظہ فرمائیے۔

میں بھی اکثر و بیشتر اس طرح کا اشارہ کیا گیا ہے:۔
مثلاً۔ خدا نے سب سے پہلے روشنی کو خلق کیا۔ (کتاب سفر پیدائش آفرینش۔ باب اول۔ آیۃ ۳)
روشنی کی اصلیت اور انبدا خدا کے علم میں محفوظ ہے۔ (ایوب۔ باب ۳۸۔ آیۃ ۱۹)
خدا ایک نور ہے۔ (اشعیاء۔ باب ۱۱۔ آیۃ ۱۷)
خدا کی مثال زمین و آسمان کے نور کی ہے۔ (قرآن۔ سورۃ ۲۴۔ آیۃ ۳۵)
خدا خود کو پردۂ نور میں ڈھانکے ہوئے ہے۔ (مزامیر۔ باب ۱۰۴۔ آیۃ ۲)
اُس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے کسی ستون پر چراغ روشن ہو۔ (قرآن۔ سورۃ ۲۴۔ آیۃ ۳۵)
خدا کا نور دُنیائے آب و گِل کو ڈھانکے ہوئے ہے۔ (ایوب۔ باب ۳۵۔ آیۃ ۳۰)
روشنی خدا کی علامت ہے۔ (مزامیر۔ باب ۳۸۔ آیۃ ۲۸)
خدا کے نور نے وادیٔ ایمن میں موسیٰ کی رہنمائی کی۔ (قرآن۔ سورۃ ۲۰۔ آیۃ ۱۰)
اس کے نور نے تاریکی میں بھٹکنے والوں کی ہدایت کی۔ (اشعیاء۔ باب ۹۔ آیۃ ۲)
خدا کی مثال آفتاب کی سی ہے۔ (مزامیر۔ باب ۸۴۔ آیۃ ۲)

اب ناظرین کے مزید اطمینان کی خاطر آگ (آتش) کے متعلق بھی قرآن مجید و دیگر آسمانی صحف سے چند مفید باتیں یہاں پر درج کی جاتی ہیں۔

آگ ہی کو قربانی کیلئے اصل ذریعہ اور واسطہ مقرر کیا گیا۔ (سفر۔ پیدائش آفرینش۔ باب ۱۵۔ آیۃ ۱۷)
قربان گاہ پر ہمیشہ اور بلاناغہ آگ روشن رکھی گئی۔ (توراۃ سفر۔ پیدائش۔ باب ۸۔ آیۃ ۲۰)
آگ کی اصلیت اسرار الٰہی میں پنہاں بتلائی گئی۔ (سفر۔ لیوی۔ باب ۶۔ آیۃ ۲۰)
سلیمان پیغمبر کے عبادتخانہ میں آگ برابر روشن رکھی گئی۔ (تاریخ ایام۔ کتاب دوم۔ باب ۷۔ آیۃ ۳)
آگ میں عود و لوبان جلا کر قربان گاہ کے اندر رکھا گیا۔ (سفر۔ لیوی۔ باب ۱۶۔ آیۃ ۱۲)
آگ کو خدا کے قہر و جلال کی علامت بتایا گیا۔ (سفر۔ خروج۔ باب ۳۵۔ آیۃ ۳)
آگ خدا کی قدرت۔ وجود۔ پاکبازی اور محافظت کی علامت ہے۔ (کتاب حزقیل۔ باب ۱۔ آیۃ ۴۔ باب ۱ آیۃ ۷)
آگ الہام اور معرفت الٰہی کی علامت ہے۔ (کتاب آرمیا۔ باب ۵۔ آیۃ ۱۴)
موسیٰ پیغمبر نے وادیٔ طویٰ میں آگ دیکھی جس نے ان سے خطاب کیا۔ کہ اے موسیٰ بیشک میں تیرا رب ہوں۔
(قرآن سورۃ ۲۰۔ آیۃ ۱۱)
آگ خدا کے انصاف کی علامت ہے اور یہی انسانی اعمال کو جانچتی ہے۔ (ذکریا۔ باب ۸۔ آیۃ ۹)[1]

---

[1] قرآن مجید میں بھی آگ ہی روز حساب کا ذکر ہے۔

آگ کے ذریعہ برائی کی سزا ملتی ہے۔ (مزامیر داؤد۔ باب ۶۸۔ آیۃ ۲۔)[1]

خدا وادی سینا میں آگ کے اندر اترا اور وہاں سے تنور کی طرح دھواں اٹھا۔ (سفر خروج۔ باب ۱۹۔ آیۃ ۱۸)[2]

اس لئے بنی اسرائیل کی رہنمائی آگ کے ذریعہ کی۔ (سفر خروج۔ باب ۸۔ آیۃ ۲۰۔ باب ۴۰۔ آیۃ ۳۸)

خدا اپنی قدرت سے ایک روشنی مثل آگ کے قائم کریگا۔ (اشعیاء۔ باب ۱۰۔ آیۃ ۱۷)

خدا کی رحمت کا ظہور ابراہیم کے لئے آگ کے اندر ہوا۔ (قرآن۔ سورۃ ۲۱۔ آیۃ ۶۹)

اب ذرا ادبیات مزدا یسنا یعنی زرتشتیوں کی مقدس مذہبی کتابوں کو بھی غور سے مطالعہ فرمائیے۔ تو یہ حقیقت منکشف ہو جائیگی کہ مذکورہ بالا اعتقاد آگ کے متعلق یہاں بھی بجنسہ نظر آتے ہیں۔ مثلاً

اہورا مزدا نے آسمانی دنیا کو پہلی مرتبہ روشنی سے منور کیا۔ (یسنا۔ باب ۳۱۔ آیۃ ۷)

خدا کی بزرگی کی دلیل اس کا نور ہے۔ (یسنا۔ باب ۳۰۔ آیۃ ۱)

خدا کا نور دنیا و آسمان کو محیط کئے ہے۔ (وبندیداد۔ باب ۲۔ یشت باب ۲۰)

اہورا مزدا کا آخری فیصلہ آگ کے ذریعہ ظاہر ہوگا۔ (یسنا۔ باب ۳۰۔ آیۃ ۲۹)

خلاق عالم نیکوں کو انعام اور بروں کو سزا آگ کے ذریعہ دیگا۔ (یسنا۔ باب ۵۱۔ آیۃ ۹)

نیک بندوں کے اعمال کی جانچ اس وقت ہوتی ہے جب مزدا کی آگ پر قربانی چڑھاتے ہیں۔ (یسنا باب ۴۳۔ آیۃ ۹)

بلاشبہ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آگ کا احترام پارسیوں کے اندر اپنی حد سے کسی قدر تجاوز بھی کر گیا ہے۔ یہانتک کہ غیر اقوام کو ان کے متعلق آتش پرست ہونیکا گمان ہو گیا۔ چنانچہ ایک زرتشتی عالم نے خود بھی اس سلسلہ میں اظہار خیال فرما کر افسوس ظاہر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:[3]-

"بعض ایسے مراسم جن کو عہد حاضر کے زرتشتی پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتے درحقیقت زرتشت کے اصلی تعالیم سے منحرف اور برگشتہ ہو جانے کے باعث رونما ہوئے ہیں۔ اور یہ مراسم طبقۂ عوام اور جہلا کی توہم پرستی کے نتائج ہیں۔ آج اکثر پارسی اپنے دینی فرشتوں کا احترام جس طور پر بجا لاتے ہیں اسے زرتشت بھی دیکھ کر ناپسند فرماتے۔ ایران میں شاہ بہرام کے قدیمی آتشکدہ پر جانوروں کی گمراہانہ قربانی ایک حد تک بت پرستی کا شائبہ لئے ہوئے ہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ بدعات رفتہ رفتہ کم ہوتے جا رہے ہیں"۔

۱۔ آتش جہنم کا ذکر قرآن شریف میں بھی ہے۔ ۲۔ قرآن کریم۔ سورۂ ہفتم میں حضرت موسیٰ کی داستان قابل مطالعہ ہے۔

۳۔ ایران و پارسیان (مؤلفہ نریمان)

تاہم یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اس طرح کی خامیاں تقریباً ہر مذہب اور ملت میں پائی جاتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ معمولی عقاید جہلا اور عوام کے درمیان ایک مخصوص حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ خود مسلمانوں میں اس طرح کی کمزوری کے وجود پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مرحوم شمس العلماء شبلی نعمانی نے صحیح طور فرمایا ہے کہ[1] مسلمانوں کا عقیدہ عرش اور کرسی کے متعلق یا اُن کا حد درجہ کا احترام کعبہ کے لئے اگر غور سے دیکھا جائے تو بُت پرستانہ رنگ سے مبرا نہیں۔ اور اس بحث نے اتنا طول کھینچا ہے کہ مسلمانوں میں ایک ایسا بھی فرقہ پیدا ہوگیا جو خدا کے جسم رکھنے تک کا قائل ہوگیا۔ خود محدثین بھی خدا کے ہاتھ اور صورت رکھنے اور اس کے روز حشر و نشر انسانی نظروں کے سامنے ظاہر ہونے پر اعتقاد رکھتے تھے[2]۔

قدیم ایرانیوں کا اہورامزدا اپنے صفات میں یہودیوں کے جیہووا۔ عیسائیوں کے خدا۔ اور مسلمانوں کے اللہ ہی جیسا ہے۔ وہی تمام کائنات کا خالق اور اسی کی مرضی پر تمام نیک و بد اعمال کا فیصلہ منحصر ہے۔ وہ واحد و یکتا ہے۔ اس کی قدرت و اختیار میں کوئی شریک نہیں۔ اور نہ کوئی قوت اس کے مقابلہ میں کامیاب ہوسکتی ہے[3]۔

زرتشتی خیال کے مطابق کل مخلوق دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک گروہ مزداپرست یعنی خدائی۔ اور دوسری جماعت دیوپرست یعنی شیطانی[4]۔ ہر انسان اپنے افعال میں مختار اور اپنی راہ نجات کے انتخاب میں قادر ہے۔ اگر وہ خدا کو اپنا ذریعہ نجات سمجھتا ہے تو پھر اسے شیطانی قوت سے جنگ اور مقابلہ لازمی ہوگا اور اس سے کامیاب نکلنے پر اُسے نجات حاصل ہوسکے گی۔ اس مقام پر بھی عوام الناس نے غلط فہمی کو راہ دیکر زرتشتیوں کا شمار کافروں میں کیا۔ اور خدا اور شیطان کے متعلق جو اس جماعت کا عقیدہ ہے اسے متعصب مصنفین نے طرح طرح کی رنگ آمیزی کے بعد لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ پارسیوں پر یہ الزام کہ وہ دو خدا کے قائل ہیں اور اُن کے عقیدہ توحید سے دوئی کا اظہار ہوتا ہے۔ سرتاپا بے بنیاد اور لغو ہے۔ بالکل یہی باتیں تو آخر قرآن میں بھی مرقوم ہیں۔ ذرا ملاحظہ فرمایئے:۔

شیطان خدا کے نیک بندوں کا مخالف اور بے ایمان لوگوں کا رہنما ہے۔ (سورۃ ۲۳۔ آیۃ ۹۷)

شیطان لوگوں کو بہکاتا اور بُرے کاموں کی طرف لے جاتا ہے۔ (سورۃ ۷۔ آیۃ ۱۲۰)

وہ بُری باتیں سکھاتا ہے۔ (سورۃ ۴۔ آیۃ ۱۲۰)

شیطان کی بدی گنہگاروں اور ایمان نہ رکھنے والوں پر اثر کرتی ہے۔ (سورۃ ۲۶۔ آیۃ ۲۲۱)

---

[1] شعر العجم جلد پنجم صہ ۱۷۹۔ [2] معتزلی اور اشعری عقاید پر مفصل بحث کیلئے ملاحظہ ہو تاریخ ادبیات ایران (مولفہ براؤن) جلد اول صہ ۲۸۱۔ [3] تاریخ پارسیان (مولفہ کارکا)۔ تجلی ایران باستان (مولفہ پیتاوالا) دینیات زرتشتی (مولفہ ڈاکٹر دھالا) ملاحظہ ہو۔ [4] ہیڈبا (مولفہ راگزین) مجوسیت قدیم (مولفہ مولٹن) اور اسی طرح کے عقیدہ کے متعلق قرآن مجید میں ذیل کی سورتیں بھی دیکھئے:۔ سورۃ ۱۶۔ آیۃ ۳۶۔ سورۃ ۱۹ آیۃ ۱۰۔ وغیرہ وغیرہ۔

شیطان نے خود کو خدا کا سب سے بڑا مخالف ثابت کیا۔ (سورۃ ۲۰ - آیۃ ۴۲)

نیک بندوں کے خلاف کاروائی کرنیوالا ہمیشہ شیطان ہوتا ہے۔ (سورۃ ۴۱ - آیۃ ۳۶)

انجام کار شیطان کو شکست ہوگی اور وہ بحکم خدا فنا کردیا جائیگا۔ (سورۃ ۴ - آیۃ ۷۶)

اب ان ہی کو ژند اوستا کی روشنی میں دیکھئے :-

بدی کا اصلی موجد دیو (شیطان) ہے۔	(وندیداد - باب ۱۹ - آیۃ ۳-۱)
دیو کی طینت ہی بدی سے ہے۔	(یسنا - باب ۶۱ - آیۃ ۲)
بدی نتیجہ ہے بُرے ایمان اور بُرے علم کا۔	(یشت باب ۲۷ آیت ۱ - وندیداد باب ۱۱ - آیۃ ۱۰)
بُرائی کا بانی بلاشبہ شر بر قوت ہے۔	(یشت - باب ۱۹ - آیۃ ۹۷)
دیو کی تمام شرارتیں بحکم خدا برباد کردی جائیں گی۔	(یشت باب ۱۰ - آیۃ ۱۱۸)

خدا مختلف اوقات میں اہرمن کی شرارت سے بندوں کو محفوظ رکھنے کے لئے اپنے رسول بھیجتا رہا ہے۔
(دینکارد - جلد اول - باب ۳۶)

(باقی)

"نگار" جنوری ۱۹۳۶ء کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں :-

ہندی شاعری کا پہلا دور (رزمیہ شاعری) ہندی شاعری کی ابتدائی حالت۔ چند بردائی - اور اسکے معصر شعراء - جگ نائک - سارنگ دھر اور ہمیر کی شاعری - گورو گورکھ ناتھ اور اس عہد کے دیگر شعراء معہ نمونہ کلام - اس عہد کے مختلف شعراء اور ان کا مختصر کلام - رزمیہ شاعری پر عام تبصرہ - جذبات و اسلوب بیان کے لحاظ سے۔

ہندی شاعری کا دوسرا دور :- (بھگتی تحریک) سوامی رامانند اور ان کے پہلے کے بھگت شعراء - مقلدین رامانند - بھاونند - ریداس بھگت - کبیر - گورو نانک دیو - میراں بائی - ملک محمد جائسی - تلسی داس - سورداس - عبدالرحیم خانخاناں وغیرہ -

ہندی شاعری کا تیسرا دور - (رزمیہ شاعری کا آغاز) کیسو داس اور ہندی شاعری کا عروج - کیسو داس کے معصر سندر داس - سیناپت بابا دین - دیال گر - بھوشن - متی رام - چنتامنی - شاعر اعظم بہاری لال اور اسکی رزمیہ شاعری پر تبصرہ - گردھر کوی رائے اور ان کی کنڈلیاں - اس عہد کے بعض سنت شعراء - اسی عہد کے بعض رزم گو شعراء - ہندی شاعری کا عروج اور شاہان اسلام۔

ہندی شاعری کا دور چہارم - (نادرشاہ کے بعد) للو لال - سدل مصر اور راجہ شیو پرشاد کی شاعری - موجودہ ہندی شاعری کے علمبردار - بھارتندو بابو ہریشچندر - پدماکر - بینی پر دین - سری دھر پاٹھک کی شاعری - شعراء حال اور ان کے کلام پر تبصرہ - ہندی شاعری پر اردو کا اثر - اردو شاعری پر ہندی کا اثر - ہندی دوہے یا اشعار ہندی رسم الخط میں بھی درج کئے جائیں گے - اور اردو رسم الخط میں بھی - ضخامت کا اندازہ ... صفحات کیا گیا ہے صرف اس ایک پرچہ کی قیمت عہ ہوگی لیکن خریداران نگار سے علاوہ سالانہ چندہ کے اور کوئی رقم زائد نہیں لی جائے گی۔ (مینیجر نگار)

دیر و حرم کے قصے

جہاں آرا اور بہتر سال

(مسلسل)

یہاں شمع و پروانہ کے اس سوز و گداز کے تماشہ پر پردہ پڑجاتا ہے۔ یا تو جہاں آرا بیگم نے درمیانی زمانہ کی داستان کو قلمبند کرنا ہی فضول سمجھا، یا اس فسانہ کے اوراق پریشان تتر بتر ہوگئے۔ اور یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ بالآخر جب پردہ اٹھتا ہے تو شہنشاہ شاہجہاں کی شدید علالت کا سین سامنے نظر آتا ہے۔ شہنشاہ دفعتاً کسی شدید مرض میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔ جان کے لالے پڑجاتے ہیں۔ جہاں آرا بیگم اور شہزادہ ولیعہد دارا شکوہ آدھی رات کو محل میں طلب کئے جاتے ہیں۔ بادشاہ کی حالت نازک معلوم ہوتی ہے۔ ہر ایک ماتم زدہ اور بدحواس نظر آتا ہے۔ صبح ہوتے ہوتے نہ صرف دارالسلطنت میں بلکہ اطراف ملک میں شہنشاہ کے فوت ہونے کی افواہ عام ہوجاتی ہے۔ شہر اور بازار بند، کاروبار ابتر اور ملک میں بدامنی اور خانہ جنگی کی تیاریاں نظر آتی ہیں۔ تینوں شہزادے تخت یا تابوت کا نعرہ بلند کرکے بغاوت کردیتے ہیں اور دارالسلطنت پر فوج کشی کی تیاریاں۔ چندہی روز میں بادشاہ کی طبیعت بہتر ہوجاتی ہے۔ اور اس نیت سے کہ رعیت کو بادشاہ کی زندگی کا علم و اطمینان ہوجائے شاہجہاں دہلی سے آگرہ کا سفر کرتا ہے۔ آگرہ پہنچکر شہنشاہ روزانہ جھروکہ درشن میں بیٹھکر رعیت کے سامنے نمودار ہوتا ہے۔ تاہم شائستہ خاں اور امین خاں اورنگ زیب کو مطلع کرتے ہیں کہ بادشاہ قریب مرگ ہے۔ اور اورنگ زیب کو آگرہ پر دھاوا کرنا چاہئے۔ یہ خطوط دارا شکوہ کے ہاتھ لگتے ہیں۔ دارا شکوہ ان دونوں امیروں کو قید کرلیتا ہے۔ لیکن روشن آرا بیگم کی سفارش سے یہ دونوں رہا کردیئے جاتے ہیں۔ پھر بھی یہ اپنی سازشوں سے باز نہیں آتے۔ اورنگ زیب کی ریشہ دوانیوں اور بادشاہ کی علالت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اورنگ زیب تقریباً دوثلث سپاہ اور سرداروں کو اپنا طرفدار بنالیتا ہے۔ اجین کی لڑائی میں شاہی فوج کو شکست ہوتی ہے۔

مراد اور اورنگ زیب آگرہ پر دھاوا بولتے ہوئے چمبل کے کنارے تک آپہنچتے ہیں۔ سلیمان شکوہ داراشکوہ کا بیٹا شہزادہ شجاع کا پیچھا بنگال میں کر رہا ہے۔ اور یہاں سوائے مہابت خاں اور راؤ راجہ چھتر سال کے داراشکوہ کے ساتھ اور کوئی نامی سردار یا سورما موجود نہیں۔

اس تمام داستان کو جہاں آرا بیگم نے نہایت دلچسپ اور رقت آمیز پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ لیکن چونکہ حکومت کی ہنگامہ آرائیوں اور ریشہ دوانیوں سے حسن و عشق کے فسانے کے لطف کو مکدر کرنا منظور نہیں۔ یہ حصہ حذف کیا جاتا ہے۔

ملک میں ہر جانب ایک طوفان برپا تھا۔ سلطنت کی خیر نظر نہیں آتی تھی۔ شاہجہاں اور جہاں آرا دونوں خاندان تیموریہ کے آیندہ عروج و بقا سے مایوس ہوتے جاتے تھے۔ داراشکوہ البتہ مقابلہ کی تیاریاں کر رہا تھا۔ راؤ راجہ چھتر سال کی اورنگ زیب سے پیچھا چھڑا کر آگرہ پہنچنے کی خبر مشہور ہو رہی تھی۔ کہ عالم بیم و امید میں جہاں آرا ایک دن سلیم چشتی کے مزار پر دعا و زاری کرنے کی غرض سے فتح پور سیکری چل کھڑی ہوئی۔

تپتی ہوئی دھوپ اور لوؤں میں جہاں آرا فتح پور سیکری پہنچی۔ علاوہ سواروں کے جہاں آرا کے ساتھ صرف اس کا ناظر اور اس کی خادمہ اور سہیلی کوکل تھی۔ نوبت خانہ سے گذر کر بلند دروازہ پر سواری ٹھہری۔ اور جہاں آرا نے مسجد کی طرف قدم بڑھایا۔ کچھ لوگ غریب اور بیکس باوصف ممانعت کے خیرات کی لالچ سے ادھر اُدھر کھڑے بیگم کی سواری کا نظارہ کر رہے تھے۔ جونہی شہزادی نے مسجد کی طرف قدم اُٹھایا اُن میں سے ایک نے جو عمر میں جوان اور صورت شکل کا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جس کی نگاہ سے وحشت اور بدحواسی کے آثار ظاہر تھے بآواز بلند اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ شہزادی چونک پڑی۔ اور اسے اپنے عالم ہراس میں یہ محسوس ہوا کہ آل تیمور کے لئے جو نسلوں سے خدا کو بھلائے ہوئے بیٹھے ہیں یہ آوازِ غیبی آخری تنبیہ کا حکم رکھتی ہے۔ وہ کانپ گئی۔ اور آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ مسجد میں پہنچکر اس نے یکسو ہو کر پہلے نماز ادا کی۔ پھر سلیم چشتی کے مزار پر سرنگوں ہو گئی۔ کچھ ڈھارس بندھی تو اکبر کے اس اُجڑے ہوئے دیار کا گشت لگانے لگی۔ دیوان خاص۔ خاص محل۔ خوابگاہ۔ پنج محل۔ پچیسی محل۔ ہر ایک پر غور سے نظر ڈالتی۔ اکبر کے زمانہ کے نظارہ اور کیفیت کو اپنے خیال میں تازہ کرتی۔ اپنے بچپن اور بھائی بہنوں کے کھیل کود کی باتیں یاد آتیں۔ آنکھوں کے سامنے ایک سماں بندھ جاتا۔ کیفیت درد اور عبرت سے آنکھیں نمناک ہو جاتیں۔ اور جب زمانۂ حال اور آیندہ کے ہنگاموں اور بربادی کی صورت سامنے آتی تو دل بیٹھنے لگتا۔ اسی خیال میں ڈوبی ہوئی جہاں آرا ایک محل کے بالاخانہ پر کھڑی ہوئی سیکری کے کھنڈروں کی طرف نظر ڈال رہی تھی۔ کہ قریب ہی پانچ سات آدمیوں کا ایک گروہ تالاب پر کھڑا دکھائی دیا۔ ان میں سے بعض کے ہاتھوں میں گانے بجانے کا ساز و سامان بھی تھا۔ شہزادی کو دیکھتے ہی ان میں سے ایک نے اپنی دینا کے ساتھ میراں بائی کا یہ بھجن شروع کیا۔

میرے تو گردھر گوپال دوسرو نہ کوئی

جا کے سر مور مکٹ میرو پتی سوئی - شنک چکر گدا پدم کنٹھ مال ہوئی ؛ مات مات بھائی بند آپنو نہ کوئی - چھوڑ دی کل کی لاج کیا کریگا کوئی
آئی تھی میں بھگت جان جگت دیکھ روئی - سادھون سنگ بیٹھ بیٹھ لوک لاج کھوئی ؛ انسون جل سینچ سینچ پریم بیل موئی -
اب تو بیل پھیل گئی امرت پھل ہوئی ؛ اب تو بات پھیل گئی جانے سب کوئی - داس میراں سرن آئی ہونی ہو سو ہوئی ؛
میرے تو گردھر گوپال دوسرو نہ کوئی

یہ وہی بدحواس اور وحشت زدہ جوان تھا جس نے چند گھنٹہ پیشتر اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا تھا - میراں کے بھجن میں درد کی کچھ کمی نہیں تھی - لیکن اس شخص کی آواز میں کچھ ایسا سوز و گداز تھا کہ جہاں آرا اس لمحہ ہمہ تن گوش ہو گئی - اور بندرا بن کی کنج گلیوں میں کنہیا اور رادھا اور کرشن اور گوپیوں کے راس منڈل اور من کی موہت کرنیوالی نبسی کا نظارہ اسکی آنکھوں کے سامنے پھر گیا - وہ چند لمحہ وہیں کھڑی رہی - پھر جب اسے ہوش آیا اور وہاں سے چلی تو ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اس نے من ہی من میں کہا کہ اگر ہند کو تباہ ہی ہونا ہے - اگر دارا کو شکست ہی بدی ہے - اگر راؤ راجہ مارا ہی گیا تو میں بھی اس کے نام پر جوگن ہو کر متوالی پھرا کروں گی - یہ کہتی ہوئی جہاں آرا پھر سلیم چشتی کے مزار پر پہنچی - ظہر کی نماز ادا کی - اور دعا و زاری میں مصروف ہو گئی - اس سے فارغ ہو کر وہ ابھی کسی قدر سکون کی حالت میں بیٹھی ہی تھی کہ کانوں میں آواز آئی کہ جیسے کوئی صحن کی طرف سے چلا آ رہا ہے - اسے فوراً اپنے راکھی بند بھائی کا خیال آیا - ابھی یہ خیال اس کے ذہن سے پوری طرح دور بھی نہ ہوا تھا کہ کسی نے دروازہ کھولا - جہاں آرا نے جو نظر اٹھا کر دروازہ کی طرف دیکھا تو راؤ راجہ چھتر سال سامنے کھڑا تھا - یہاں سے جہاں آرا کی آپ بیتی خود اس کی زبانی سنئے :-

میری حیرت کی کوئی حد نہ تھی - ایسے معجزے بھی دیکھنے میں آتے ہیں - باوجود اس حیرت کے میں از سر تا پا سکون و اطمینان میں تھی - مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا میں دنیا میں کئی جنم لے چکی ہوں اور تمام جنموں کے سنسکار اس لمحہ انتہائی مسرت کی شکل میں نمودار ہوئے ہیں - دیکھنے کو میں جہاں آرا تھی - لیکن در اصل وہ لازوال شعلۂ نور جو ازل سے اب تک ہر جسم خاکی میں پنہاں رہا ہے - میں نے چہرہ سے نقاب الٹ دیا اور آنکھیں چار ہوئیں - وہ راز جو اب تک میری سمجھ میں نہ آیا تھا - وہ بات جس سے میں برابر دھوکا کھاتی رہی اس ایک لمحہ میں مجھ پر آشکارا ہو گئی - اور مجھ کو یقین ہو گیا کہ وہ خط جس نے میری زندگی تلخ کر رکھی تھی اور جو میری بربادی کا باعث ہوا تھا اسکا لکھا ہوا نہ تھا - بلکہ میرا خط بھی اس تک نہ پہنچا تھا - اس کی نگاہ ایک خاص کیفیت سے سرشار تھی لیکن کیسی معصوم! مگر چشم زدن میں اس کے چہرہ کا رنگ بدلا - اس کی پیشانی پر شکن پڑی اور میں نے نقاب چہرہ پر ڈالکر اسے راکھی بند بھائی کے لقب سے خطاب کیا - اس نے مجھے اسی شان اور ادا سے سلام کیا جیسے اول دن کیا تھا - ہم دونوں قالین پر بیٹھ گئے - اور میں اس کے پیغام کے سننے کے لئے سراپا گوش بن گئی - راؤ راجہ نے کہا کہ سلطنت کا مقدر اس وقت میرے ہاتھ میں ہے - اور اسی لئے وہ مجھے ڈھونڈتا یہاں تک پہنچا ہے - اس نے مجھے بتایا کہ شہنشاہ نے آج ہی یہ ارادہ ظاہر کیا ہے کہ وہ معرکۂ جنگ میں بہ نفس نفیس خود اپنی فوج کی سرداری اور

رہنمائی کریں گے۔ لیکن شائستہ خاں اور خلیل اللہ خاں۔ جو دونوں کے دونوں دوست نما دشمن ہیں شہزادہ ولیعہد کو اپنے مشورہ سے گمراہ کر رہے ہیں۔ اور دارا شکوہ اس پر مصر ہے کہ فوج کا سپہ سالار وہ خود بنے۔ یہ راستہ تباہی کا ہے۔ اور اگر دارا شکوہ کو اس سے کوئی باز رکھ سکتا ہے تو وہ میں ہوں۔ مجھے یہ کیفیت معلوم کر کے رنج ہوا۔ میں نے اطمینان دلایا کہ مجھ سے جو کچھ ہو سکیگا میں کروں گی۔

وہاں سے اٹھ کر ہم دونوں محل خاص کے ایک کمرہ میں پہنچے اور وہاں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ میں نے سب سے پہلے اس سے اپنے خط اور اس کے جواب کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے دونوں سے لاعلمی ظاہر کی۔ میرا اطمینان ہوگیا۔ پھر اورنگزیب کی ریشہ دوانیوں اور رموز مملکت کی الجھی ہوئی گتھیوں کے متعلق بڑی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اکبر اور نگ زیب راجستھان کے راجپوتوں، سب ہی کا تذکرہ باری باری سے ہوا۔ اگلی اور پچھلی سب ہی باتیں یاد آ گئیں۔ ہند کی ذلت اور بربادی کا خیال آتے ہی راؤ راجہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس کے خون میں جوش پیدا ہوا اور تیوریاں بدل کر بولا:-

"محمود غزنوی کو ہند کی دارالسلطنت کا محاصرہ توڑنے اور ناکام واپس جانے پر جس نے مجبور کیا تھا وہ ایک چوہان راجپوت ہی تھا۔ اس کے بعد محمود غزنوی پھر حملہ آور نہ ہوا۔ مگر افسوس کہ اس معرکہ میں اجمیر کا چوہان مہاراجہ کام آ گیا۔ ایک صدی اور گذری اور اس کے بعد ہند کی غلامی کا دور شروع ہوا۔ قنوج کے راجہ نے محمد غوری سے ساز باز کر کے دہلی اور اجمیر کے مہاراجہ پرتھوی راج کو شکست دلوائی۔ گو اس کے بعد قنوج بھی تباہ ہوگیا۔ لیکن ہندوستان پر پھر ہمیشہ کے لئے غیروں کا تسلط ہوگیا۔"

میں:- سنجوگتا! (یہ نام میں نے اپنی دانست میں اس قدر آہستہ سے لیا تھا کہ گویا میں صرف اپنی یاد تازہ کر رہی تھی لیکن اس نے سُن ہی لیا اور بولا:-

راؤ راجہ:- پرتھوی راج سنجوگتا کو قوت و اقتدار سے کہیں زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ ایک دفعہ نہیں بارہا ایسا ہوا ہے کہ ہم راجپوتوں نے محبت اور ننگ و ناموس پر سے ہر چیز قربان کر دی ہے۔ اور معرکۂ جنگ میں پھاند پڑے ہیں۔ اُسوقت فتح اور شکست کا بھی خیال نہیں رہا ہے۔ بیگم اپنے آنچل سے ایک پٹی پھاڑ کر بطور اپنی نشانی کے میری کلائی پر باندھ دو۔ تاکہ لڑتے وقت تم میری نظر کے سامنے ہو۔ اسلام کی زبردستیوں کے خلاف تو راجپوت ہمیشہ سے لڑتے آئے ہیں اور میں بھی انکا مقابلہ کرنے سے گریز نہ کرونگا۔ لیکن تمہاری نشانی اگر میرے سامنے ہوگی تو میں تمہارے ننگ و ناموس کا بھی ویسا ہی پاس و لحاظ کروں گا کہ جیسا اپنے ننگ و ناموس کا۔ کیونکہ یہ دونوں میری نگاہ میں ایک ہی عزت رکھتے ہیں۔

یہ سنتے ہی میری جان میں جان آئی۔ مجھے پورا پورا اطمینان ہوگیا۔ میں نے اپنے دوپٹہ میں سے ایک پٹی پھاڑ کر اسکی کلائی پر باندھ دی۔ میں وہاں سے اٹھی۔ راؤ راجہ میرے ساتھ تھا۔ شام ہوگئی تھی دن ڈھل چکا تھا۔ سماں نہایت دلکش تھا۔ سامنے تالاب تھا جہاں بابر اُسوقت جب سیکری محض ایک گاؤں تھا۔ مچھلیوں کا شکار کھیلا کرتا تھا۔ ہم

دونوں ٹہلتے ٹہلتے وہاں پہنچے - اور میں تالاب کے قریب چبوترہ پر بیٹھ گئی - راؤ راجہ چبوترہ کی سیڑھیوں پر ٹھہر گیا - وہ گردن پھیر کر کسی چیز کو غور سے دیکھ رہا تھا مجھے اس کے دوپٹہ میں دو موتی چمکتے نظر آئے - میں نے اپنے گلے کے گلوبند کو پہچانا اور خوشی سے میری باچھیں کھل گئیں - اس نے گردن اٹھا کر کہا :-

"دیکھئے بیگم صاحب سامنے والے میدان کے آگے جو نشیب ہے بابر اور رانا سانگا میں وہیں لڑائی ہوئی تھی"

میں :- میں تو ان خانہ جنگیوں اور خونریزی سے تنگ آگئی ہوں - ان باتوں کے ذکر سے میری طبیعت محظوظ نہیں ہوتی - خدا کرے کہ یہ لڑائی جو درپیش ہے آخری لڑائی ہو اور دارا فتحیاب ہو کر فتحپور سیکری میں اپنی فتح کا جشن منائے -

راؤ راجہ :- (نہایت لاپرواہی سے) فتحپور سیکری چتوڑ کی آخری تباہی کے دوران میں بسایا گیا تھا - اکبر نے بھی تو اپنی سلطنت کی بنیاد خونریزی ہی پر قایم کی تھی - اور خونریزی ہی نے اس سلطنت کو قائم اور مستحکم رکھا ہے - اکبر کا ارمان یہ ضرور تھا کہ وہ اپنے نئے عقیدے اور ایمان سے ہندوستان میں متحدہ قومیت پیدا کرے - لیکن جس طرح تیمور لنگ کی عظیم الشان سلطنت اس کے بعد قایم نہ رہ سکی کیونکہ وہ نہایت عظیم الشان تھی - اسی طرح اکبر کا خواب و خیال بھی اس لئے پورا نہ ہو سکا کہ وہ نہایت جلیل القدر تھا -

میں :- (اضطراب کے ساتھ) اکبر ہند کی رعیت سے محبت رکھتا تھا - اس نے راجستھان کی کماریوں کو رانیوں اور بیگموں کا مرتبہ دیا -

راؤ راجہ :- ہاں لیکن اس نے ان کے ننگ و ناموس کا پاس و لحاظ ہمیشہ نہیں کیا - لوگ راجستھان میں آجتک کہتے ہیں کہ اکبر پرتھوی راج کی رانی پر بُری نگاہ ڈالتا تھا - اور ایک دفعہ جشن نوروزی کے موقع پر اس نے رانی پر ہاتھ ڈالنا چاہا تھا - لیکن رانی کمر سے خنجر نکالکر مقابلہ کے لئے تیار ہو گئی -

یہ سُن کر میری پیشانی پر بل پڑ گئے - میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی - میں نے جوش میں آکر کہا - آدمی آدمی میں بڑا فرق ہوتا ہے - اکبر معمولی آدمی نہ تھا - کتنی عورتیں ہیں جو اس کی ایک نگاہ پر اپنے تئیں قربان نہ کر دیتیں -

یہ سنکر راؤ راجہ کے چہرہ کا رنگ بدلا - اس نے اپنی گردن جھکا کر نگاہیں نیچی کر لیں - میں سوچنے لگی کہ میں بھی تو راجستھان کے ایک شہزادہ پر اپنا تن من سب نچھاور کرنے کے لئے تیار ہوں - یہ خیال آتے ہی میں مسکرا دی - میرا نقاب بہت باریک تھا - اس نے غالباً مجھے مسکراتے دیکھ لیا -

راؤ راجہ :- (مسکرا کر بولا) شہزادی معاف کرنا - کچھ خیال آگیا تھا - سپاہی کا خون بہت جلد کھولنے لگتا ہے - معاف کر دو - میں تمہارا ویسا ہی غلام ہوں جیسا تھا - اکبر کی عظمت اور اسکے سلک کا میں ہمیشہ سے قائل رہا ہوں - اور اب بھی ہوں (یہ کہکر اس نے اس تعویذ کو جو میں نے اس کے ہاتھ پر باندھا تھا بوسہ دیا اور مجھے دیکھنے لگا)

چونکہ دن ڈھل چکا تھا اور دیر ہو گئی تھی - میں نے آگرہ واپس جانیکا قصد صبح تک ملتوی کر دیا - ملک میں شورش

اور بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ لہذا راؤ راجہ کو میرا تنہا فتحپور سیکری میں رات کو ٹھہرنا اندیشہ سے خالی نہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بھی طے کیا کہ وہ رات کو وہاں ٹھہریگا۔ اور صبح ہوتے ہی جائیگا۔ میں نے محل کے ایک حصہ میں اس کے ٹھہرنے کا انتظام کرا دیا شام کو ہم دونوں محل میں پھر ملے۔ کومل نے بڑے سلیقہ سے دستر خوان بچھایا۔ میوہ جات اور لوزبات اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے چنے ہوئے تھے۔ شمع و فانوس کمرہ کو جگمگا رہے تھے اور پھولوں کی خوشبو دماغ کو معطر کر رہی تھی۔ راؤ راجہ مہمان تھا اور میں میزبان۔ ہم دونوں قریب قریب بیٹھے تھے۔ لیکن صدیوں کی سرگذشت اور موجودہ کشمکش اور ہنگامہ آرائیاں ہم میں فاصلہ پیدا کر رہی تھیں۔ میں نے جام شراب بھر کر اپنے ہاتھ سے راؤ راجہ کی طرف بڑھایا۔ سلسلۂ گفتگو شروع کرنے کے لئے مجھے اور تو کچھ سوجھا نہیں۔ میں نے پوچھا:۔

آخر آپ لوگ جب اپنے ہاتھ سے انسانی جانوں کا خون کرتے ہیں تو کیا اس کی کراہت کا احساس آپکو نہیں ہوتا؟

راؤ راجہ:۔ (اس نے جام شراب بلا منہ سے لگائے ایک طرف رکھ دیا اور سنجیدگی سے بولا) اگر ہم راجپوتوں کو تلوار چلانی نہ آتی ہوتی تو نہ راجستھان باقی رہتا نہ سلطنت مغلیہ۔ شہزادی مرنا اور مارنا تو زندگی کا اتار چڑھاؤ ہے ورنہ خالق و مخلوق کا رشتہ تو استحکام ابدی رکھتا ہے۔ کم ازکم میں نے تو جب کبھی شہنشاہ کی رفاقت میں تلوار بے نیام کی اور دشمنوں کا خون بہایا ہے تو سوائے ننگ و ناموس کے تحفظ کے اور کوئی جذبہ مجھ پر غالب نہ تھا۔ اور جس دن میں لڑائی میں کام آجاؤنگا میں سمجھونگا کہ میں نے دنیا میں سپاہی کا فرض ادا کیا۔ عاقبت کی خبر خدا جانے۔

یہ سنتے ہی میری طبیعت بےچین سی ہوگئی اور مجھ پر خوف طاری ہوا کہ مبادا میرا محبوب مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوجائے کھوئی ہوئی سی حالت میں میں نے کہا:۔

"ہر لحظہ کی شورش آخر کس کو بھاتی ہے۔ کیا ہم امن و سکون کے جویا نہیں؟ کشت و خون و ہنگامہ آخر تابکے؟

راؤ راجہ:۔ شہزادی ایک زمانہ گذرا کہ ہند میں مہاراجہ اشوک بڑا چکرورتی راجہ ہوا تھا۔ اس نے کشت و خون سے توبہ کی تھی۔ وہ امن و آشتی کا فرشتہ تھا۔ شانتی اسکا سبھاؤ تھا۔ خونریزی کرنا یا جان لینا اس کے نزدیک بڑا گناہ تھا۔ وہ اس گناہ کا مرتکب ہوا۔ مگر نتیجہ کیا نکلا۔ آریہ ورت کا دروازہ دوست و دشمن سب کے لئے کھلا رہا۔ دشمن آئے اور جوق جوق آئے۔ کشت و خون بھی جتنا کرسکتے تھے کیا۔ حتیٰ کہ ہند اس حالت کو پہنچ گیا۔

داستان پارینہ سے درگذر کرکے آنیوالی پریشانیوں اور اورنگ زیب اور مراد کی ریشہ دوانیوں کا تذکرہ ہونے لگا۔ میں سب کچھ سنتی جاتی تھی۔ کبھی چپ ہوجاتی کبھی جواب دیدیتی۔ لیکن جوں جوں وقت گذرتا جاتا میری طبیعت اداس ہوتی جاتی۔ کیونکہ میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن تاب گویائی نہ تھی۔ جو باتیں کرنے کو دل چاہتا تھا وہ زبان سے نکلتی نہ تھیں۔ جب رات زیادہ گذرنے لگی مجھے خیال آیا کہ راؤ راجہ کو تڑکے ہی روانہ ہونا ہے۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ راؤ راجہ نے رخصت چاہی۔ میں سراپا انتظار تھی۔ کہ وہ بولا:۔

"شہزادی! جب آپکا کوئی پیام مجھ کو نہیں ملا تو میں سمجھا کہ آپ نے مجھے بھلا دیا۔ تاہم میرے دل سے آپ کی صورت کا وہ نقش جو میں نے اپنے خیال میں کھینچا تھا ماند نہیں پڑا۔ اور میں اسی تصور کا غلام رہا۔ لیکن اب جبکہ مجھ کو آپکا دیدار نصیب ہو چکا ہے۔ اب جبکہ میری اور آپ کی آنکھیں چار ہو چکی ہیں۔ قسمت ہی یاری نہ کرے تب تو بات دوسری ہے۔ ورنہ چھتر سال آپ سے جدا نہیں رہ سکتا۔"

یہ کہکر اس نے قدم اٹھائے اور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں اپنی خوابگاہ پہنچی۔ اُمید و بیم نے طبیعت کو الجھن میں ڈال رکھا تھا۔ کچھ کھوئی ہوئی سی تھی۔ سامنے گلدان میں پھول چُنے ہوئے رکھے تھے۔ بے تحاشہ دوپٹہ کی روپہلی تاریں نکال کر اور چمپا کے پھول گلدان سے لیکر ہار گوندھنے لگی۔ ہار گوندھتے گوندھتے میں کمرہ کے برآمدہ میں جا کھڑی ہوئی۔ اور جھک کر دیکھنے لگی۔ اپنے کمرہ کے برآمدہ میں راؤ راجہ بھی کھڑا ہوا تھا۔ کچھ تو شرماتی تھی کہ کہیں وہ مجھے دیکھ نہ لے۔ اور کچھ انتظار تھا کہ اس کی نگاہ میری طرف پڑے۔ لیکن وہ کسی غور و فکر میں ڈوبا ہوا سامنے دیکھ رہا تھا۔ لمحہ بھر بعد وہ کمرہ میں چلا گیا اور میں بھی اندر آ گئی۔ کوئل چٹائی پر پڑی ایک طرف سو رہی تھی۔ میں بھی غلطاں و پیچاں پلنگ پر کچھ دیر پڑی رہی کہ دیکھئے اس کمبخت جنگ کا کیا حشر ہوتا ہے۔ کبھی ملنا بھی بدا ہے کہ نہیں۔ میں اسکی صورت بھی دیکھ سکوں گی کہ نہیں۔ اتنی دیر کے لطفِ صحبت کے باوجود دل کی بات دل ہی میں رہی۔ اور کچھ کہنے نہ پائی۔

اسی خیال میں میں پلنگ سے اٹھی۔ اس دروازہ تک پہنچی جو میرے اور راؤ راجہ کے کمرہ کے درمیان بند تھا۔ بلا کسی ارادے کے جس طرح خواب میں کوئی نقل و حرکت کرتا ہے میں نے دروازہ کھولا مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ گویا دروازہ خود بخود کھل گیا۔ میں اندر داخل ہوئی۔ کمرہ چاندنی سے روشن تھا۔ راؤ راجہ ایک مرگ چھالا پر ننگے سر سو رہا تھا۔ چاندنی اس کے چہرہ پر پڑ رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ لیکن ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اُس وقت اسکا حُسن انتہا درجہ دلفریب تھا مجھے اس کی موہنی مورت کبھی ایسی بھولی اور پیاری نہیں معلوم ہوئی تھی۔ ایک لمحہ تو میں کھڑی محوِ نظارہ رہی اور پھر پاؤں پھیلا کر ہاتھ کے سہارے اسکے پہلو میں بیٹھ گئی۔ اس وقت مجھ پر وہ عالمِ محویت طاری تھا کہ مجھ کو دنیا و مافیہا کی خبر نہ تھی۔ نہ جو کچھ گذر گیا اسکا غم تھا نہ جو کچھ پیش آنیوالا تھا اسکی فکر تھی۔ اگر کسی بات کا احساس تھا تو صرف اس کا کہ میں ہوں اور میرا محبوب اور تیسرا کوئی مخل نہ ہو۔ لطفِ محبت کا یہ ایک لمحہ مجھے اپنے نشہ سے اس طرح سرشار کئے ہوئے کہ گویا یہی تمامتر زندگی ہے۔ ہم دونوں کی یہ چھوٹی سی دُنیا مجھے اس لمحہ کُل کائناتِ عالم میں محیط اور چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ زندگی کا تمام تر مقصد۔ میری ساری امیدیں اور خواہشیں بس اس ایک ارمان میں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھیں۔ کہ اگر وہ اس لمحہ جاگ جاتا اور آنکھیں چار ہو جاتیں تو میں اپنے اس سوزِ نہانی کا راز جس سے ساری عمر تڑپا کی اپنی زبان سے اس پر آشکارا کر دیتی۔ اور جواب میں پیامِ محبت و پیمانِ وفا کے دو کلمے اپنے کانوں سے سُن لیتی۔ چاہتی تھی کہ جگا دوں۔ شوق و انتظار تھا کہ وہ جاگ جائے۔ لیکن وسوسہ تھا کہ کہیں آنکھ کھلتے ہی یہ کیفِ خامشی جاتا نہ رہے۔ اس لمحہ کا جادو

ٹوٹ نہ جائے - مجھے اس غلبۂ جذبات میں مشکل سے چند منٹ گذرے ہوں گے کہ اس نے ایک لمبی سانس لی - اور کروٹ بدلی - میں سراپا انتظار تھی کہ دفعتاً کمرہ کے پاس ہی کچھ شور سا ہوا - بھاری بھاری قدموں کی آواز سنائی دی - جیسے کوئی آیا اور جلدی واپس دوڑا - میں سہم گئی - اٹھی اور سیدھی اپنے کمرہ میں واپس آئی - میرا دل بلیوں اُچھل رہا تھا - پسینہ میں شرابور تھی - تکان نے چور چور کر دیا تھا - چند لمحہ افسردگی کی حالت میں پلنگ پر پڑی رہی لیکن پھر آنکھ لگ گئی -

تڑکا ہوتے ہی کسی کے زور سے چیخنے کی آواز نے مجھے جگا دیا - اسی وقت کونیل باہر سے کمرہ میں گھبرائی ہوئی آئی - میں نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ اس نے یہ خبر سنائی کہ پہرے والوں نے کسی آدمی کو جو زبردستی محل میں داخل ہونا چاہتا تھا - قتل کر دیا - مجھے کچھ زیادہ غم نہ ہوا - کیونکہ میں یہ سمجھی کہ غالباً یہ وہی آدمی ہو گا جس نے رات کو مجھے خائف کیا تھا - تاہم اس کی چیخ کی آواز دیر تک میرے کانوں میں گونجتی رہی - کونیل سے یہ بھی معلوم ہوا کہ راؤ راجہ بڑے تڑکے ہی سوار ہو کر آگرہ روانہ ہو گیا - میں جب پلنگ سے اٹھنے لگی تو مجھے اس ہار کا دھیان آیا جو میں رات کو گوندھ رہی تھی - میرے آس پاس کہیں اسکا پتہ نہ تھا - خیال آیا کہ جب میں راؤ راجہ کے کمرہ میں گئی تھی تو ہار میرے کمرہ میں تھا - وہاں جا کر دیکھا تو وہاں بھی نہ پایا - مجھے یقین ہو گیا کہ وہ راؤ کے ہاتھ لگا اور اس کے ساتھ گیا - میں دل ہی دل میں شرمائی کہ اب جب ملاقات ہو گی تو مجھ سے آنکھیں چار کیسے کی جائیں گی - تاہم میں خوش ہوئی کہ جس کے لئے گوندھا گیا تھا اسی کے ہاتھ لگا -

تھوڑی دیر بعد میں تیار ہو کر سوار ہو گئی - ہماری سواری جس وقت نوبت خانہ سے نکلی تو کسی ہندو کی ارتھی جلانے کے لئے گھاٹ لے جائی جا رہی تھی - نہ معلوم کیوں میں پوچھ بیٹھی کہ یہ کس کا جنازہ ہے - معلوم ہوا کہ یہ وہی شخص ہے جو تڑکے پہرے والوں کے ہاتھ سے مارا گیا - گو دیوانہ تھا تاہم اس کی آواز بڑی سُہولی تھی اور گاتا اچھا تھا - بیگم صاحب کو بھیروں سنانا چاہتا تھا اسی لئے مارا گیا - کسی نے یہ بھی کہا کہ اس نے کہیں سے ایک جڑاؤ پہونچی چرا لی تھی جو ہر وقت گلے میں ڈالے رہتا تھا - مجھے فوراً دھیان آیا کہ یہ وہی شخص ہو گا جس نے میراں بائی کا گیت سنا کر مجھے خوش کیا تھا - اور جس کو میں نے اپنی پہونچی انعام دی تھی - اسکی ماں روتی پیٹتی ارتھی کے ساتھ جا رہی تھی - میں نے ناظر کو حکم دیا کہ پہونچی عورت سے واپس نہ لی جائے بلکہ دوسری پہونچی بھی اتار کر دیدی - مجھے اس شخص کے مارے جانے کا افسوس ہوا - اور شگون اچھا نہیں معلوم ہوا -

جب میں آگرہ پہنچی تو ہر طرف جنگ کا چرچا اور لڑائی کی تیاریاں دکھائی دیں - میں اپنے بھائی دارا کے پاس جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی کہ مجھے ایک خط ملا - یہ چھترسال کا تھا - اس نے مجھے یہ اطلاع دی تھی کہ دارا یہانتک بضد ہے کہ اگر اسکو فوج کا سپہ سالار مقرر نہ کیا جائیگا تو وہ سینہ میں خنجر مار کر خودکشی کر لیگا - اس دھمکی کا اثر شہنشاہ پر یہ ہوا کہ دارا کے فوج کا سپہ سالار مقرر کئے جانیکا حکم بادشاہ نے صادر کر دیا - اور اب کچھ نہیں ہو سکتا - اسی خط میں میرے محبوب نے رن کے لئے روانہ ہونے سے پیشتر مجھ سے آخری ملاقات کی درخواست بھی کی تھی - چنانچہ دوسرے روز شام کو

میں تاج محل میں اس سے ملنے گئی۔ تاج کا سین حد درجہ پُر لطف و دلفریب تھا۔ بزم گُل و لالہ آراستہ تھی۔ سبزہ قدموں کے نیچے بچھا تھا۔ سرو پاسبان تھے۔ ہر طرف سکون کا تسلط تھا۔ چاندنی کی جگمگاہٹ سے محفل روشن تھی۔ قدرت گلاب اور چمیلی کی خوشبو سے تواضع کرتی تھی۔ چڑیاں گھونسلوں میں بسیرا لیتے چہچہاتی جاتی تھیں۔ ان کا چہچہانہ نغمہ کا لطف دیتا تھا۔ اور تاج کا جوبن اور نکھار تو غضب ڈھاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ پیکرِ حُسن چاندنی کے آئینہ میں اپنا عکس دیکھ کر خود ہی محوِ حیرت ہے۔ حُسن و محبت کی اس تصویر کو دیکھ کر میں عش عش کر رہی تھی کہ پیچھے سے کسی کے قدموں کی آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ گردن پھیر کر دیکھا تو راؤ راجہ تھا۔ جب نگاہیں ملیں تو اس نے سر جھکا دیا۔ میں نے سلام قبول کیا۔ اور ہم دونوں سنگ مرمر کے حوض پر بیٹھ گئے۔ میری طبیعت تو اس وقت جنگ و تذکرۂ جنگ کی طرف ایک لمحہ بھی دھیان دینے کو نہ چاہتی تھی۔ لیکن اس سے گریز و پناہ بھی نہ تھی۔ معلوم ہوا کہ اورنگ زیب اور مراد کی فوجیں چمبل کے کنارے پڑی ہیں۔ اور یہاں سے شاہی فوج کو صبح ہی مقابلہ پر جانے اور کوچ کرنے کا حکم مل گیا ہے۔ شہنشاہ کی مرضی تھی کہ ولیعہد سلیمان شکوہ کے بنگالہ سے واپس آنے تک انتظار کرے۔ لیکن اب توقف کا موقع نہ تھا۔ چمبل پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہونے کو تھا۔ راستہ کے تمام ناکوں کی مورچہ بندی ہو چکی تھی۔ صرف ایک مقام جو راجہ چمپت کے علاقہ میں تھا اس لئے باقی چھوڑ دیا گیا تھا کہ راجہ نے پختہ وعدہ کیا تھا کہ وہ غنیم کی فوج کو کسی حالت میں راہ نہ دیگا۔ راؤ راجہ کو راجہ چمپت کے وعدہ پر پورا بھروسہ نہ تھا۔ اور سب سے زیادہ خطرہ اس کو سردار خلیل اللہ خاں کی جانب سے تھا۔ غضب یہ تھا کہ خلیل اللہ خاں کی کمان میں تیس ہزار سپاہی تھے۔ راؤ راجہ نے غم و غصہ کے لہجہ میں کہا کہ اگر شہزادہ ولیعہد اب بھی خلیل اللہ خاں کی مکاری اور چاپلوسی سے آگاہ ہو جائے تو اورنگ زیب کے گولے اور بارود کا مقابلہ تو چنداں دشوار نہ تھا۔

میں یہ سنکر تھوڑی دیر تک سوچ میں پڑی خاموش رہی۔ پھر میں نے چونک کر کہا کہ راؤ راجہ تمہارے راجپوت سورمااور رام سنگھ کے سواروں کا رسالہ تو قابلِ اعتبار ہے؟ راؤ راجہ نے مجھے اطمینان دلایا کہ میں اُدھر سے بے فکر رہوں۔

جنگ و تذکرۂ جنگ کو بالآخر دماغ سے ہٹا کر ہم دونوں حوض پر سے اُٹھے اور تاج کی جانب چلے۔ راؤ راجہ کچھ اُداس اور سوچ میں تھا۔ اس کی نظر تاج پر پڑی۔ ایک لمحہ ٹھہرا اور تاج کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ میں اسکو دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ سے بولا:۔

"آدمی بھی عجب طرفہ تماشہ ہے۔ اپنی ہمت و قوت سے دُنیا پر حکومت کرتا ہے۔ بناتا بھی ہے بگاڑتا بھی ہے جس شئے کو ساخت کرتا ہے اسی کو غارت بھی کرتا ہے۔ انسان کی یہ طاقتِ ازلی اس کے حرکات و سکنات سب پر غالب رہتی ہے۔ ہاں اگر اس سے بھی کوئی قوت زبردست ہے تو وہ عورت کی ہے۔ جب عورت کا م دیو کے نقشِ قدم پر

چلنے لگتی ہے تو یہ اسی کا کرشمہ ہے کہ وہ نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کر دیتی ہے "

یہ سنتے ہی مجھے اپنے چمپا کے ہار کا دھیان آیا۔ اور شبہ ہوا کہ کہیں اسکا اشارہ اس رات والی واردات کی طرف تو نہیں۔ اس لمحہ میرے دل کی بےچینی بڑھنے لگی۔ غلبۂ جذبات سے مجبور ہو کر میں ٹھٹکنے سی لگی۔ ایک محراب میں دم لینے کھڑی ہوگئی۔ راؤ راجہ نے فوراً ہی اپنا شال میرے بیٹھنے کے لئے بچھا دیا۔ میں بیٹھ گئی۔ میں نے ہمت باندھی۔ اور سوچا کہ جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالوں۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں زبان کھولوں ایک عجیب کیفیت پیش آئی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا نجابت خاں جسکا مجھے کبھی دھیان بھی نہ آتا تھا اس لمحہ میرے سامنے غیظ و غضب کی حالت میں کھڑا مجھے دھمکا رہا ہے۔ میں راؤ راجہ کو مخاطب ہی کیا چاہتی تھی کہ وہ بڑے غور و تامل کے بعد خود ہی بولا کہ " اورنگ زیب کے تمام لشکر میں سب سے پہلے اگر میں کسی شخص کا خاتمہ کیا چاہتا ہوں تو وہ نجابت خاں ہے " میں گھبرا کر لیکن ضبط سے بولی کہ " کیوں " ؟ اس نے جواب میں کہا:۔

" اس لئے کہ مجھے اس سے سخت تنفر ہے "

مجھے شک ہوا کہ مبادا اس نے کچھ سنا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں اس کے دل میں میری طرف سے کچھ شبہ ہو جائے۔ میں نے فوراً ہی مُنہ سے نقاب اُلٹ دیا۔ کہ وہ میری نگاہ و بشرے سے میرے دل کی کیفیت معلوم کرلے۔ اور اس کو یقین ہو جائے کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی تیسرا شخص حائل نہیں۔ کُجا نجابت خاں! نقاب اُلٹنے کے فوراً ہی بعد میں نے ہمت کر کے بالآخر کہہ ہی ڈالا " راؤ راجہ تمہیں اس خط کا کچھ دھیان ہے۔ جس کو میں نے تعویذ بنا کر اپنے سینہ سے لگا رکھا ہے ؟ اس میں لکھا تھا کہ اگر میں سچ کہتا بھی ہوتی۔۔۔۔۔۔۔۔ " اتنا کہہ کر میری زبان خود بخود رک گئی۔ راؤ راجہ کے چہرے کا رنگ بدلا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ اور کہنے لگا:۔

" سالہا سال ہوئے کہ میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ یہ خوابِ شباب نہ صرف سُہانا بلکہ ایسا لطیف و پاکیزہ تھا کہ باوجود ایک عرصہ گذر جانے کے مجھے اس طرح یاد ہے کہ گویا کل کی بات۔ وہ جوانی کی عمر تھی اور مجھے خوابوں پر عقیدہ تھا۔ لیکن زمانہ اور تجربہ نے ثابت کیا کہ خواب حقیقتِ زندگی سے بہت دُور ہوتے ہیں۔ ان کی اصلیت بہت کم ہوتی ہے۔ ان کا سماں صرف چاندنی رات ہی میں بندھتا ہے۔ روزِ روشن میں یہ دھوپ کی تیزی سے کہرے کی طرح پھٹ جاتے ہیں۔ جنگ کے معرکوں کی یادگار تو دیکھو میری پیشانی " تلوار کے گھاؤ کے نشان کی صورت میں صاف صاف دکھائی دیتی ہے لیکن جہاں آرا بیگم زندگی نے جو چرکے دیئے۔ خوابِ شباب کی اُمنگوں کو جس طرح مٹایا اُن زخموں کے داغ میرا دل چھپائے بیٹھا ہے۔ وہ نظرِ اغیار کے تماشہ کے لئے نہیں۔ مگر یہ سچ ہے کہ خوابِ شباب جوں جوں حقیقتِ زندگی سے دُور ہوتا جاتا ہے اُتنا ہی سُہانا اور پیارا معلوم ہونے لگتا ہے۔ اور انسان اس امید پر جیتا ہے کہ جو کچھ اس دُنیا میں ہاتھ نہ لگا اُس دُنیا میں ملیگا "

یہ سُنکر میری نگاہیں نیچی ہوگئیں۔ ہم دونوں تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حوادثِ زندگی ہم دونوں

کو ایک دوسرے سے نہ صرف جدا بلکہ دُور کرتے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ میں یہ بھی محسوس کرتی تھی کہ درحقیقت ہم ایک جان دو قالب ہیں۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد میں نے آہستہ سے کہا۔ "چلئے روضہ کے اندر چلیں"۔ مجاور مقبرے سے ہٹادیے گئے تھے۔ چراغ روشن تھے۔ موتیوں ٹکی ہوئی زردوزی کے کام کی چادر جو ہر جمعہ کو میری ماں کی قبر پر چڑھائی جاتی تھی ابھی ابھی ڈالی گئی تھی۔ عود و عنبر کی خوشبو سے تمام مقبرہ مہک رہا تھا۔ ہم دونوں ایک لمحہ قبر کے سرہانے مودبانہ خاموش کھڑے رہے۔ پھر وہاں سے ہٹ کر مجّر کا طواف کرنے لگے۔ میں نے اپنے محبوب سے کہا کہ وہ کوئی ایسا نام جو اُسے پیارا ہو اپنے گلے سے ایسی آواز سے نکالے کہ اس کی ہر طرف گونج سنائی دے۔ لمحہ بھر میں میرا نام تاج کے تمام گنبد میں اس طرح گونج اٹھا کہ گویا کسی فرشتہ نے در و دیوار میں جان ڈال دی ہے۔

میں نے اپنا سارا پُرانا دُکھڑا کہہ سنایا۔ تمام داستانِ زندگی لکھ ڈالی۔ لیکن اب میرا قلم آگے چلنے سے خود بخود رُکتا ہے جو راز و نیاز کی باتیں اس وقت میرے اور میرے محبوب کے درمیان ہوئیں وہ میری نگاہ میں ایسا تقدس رکھتی ہیں کہ میں ان کو لکھنا نہیں چاہتی۔ البتہ یہ ضرور کہوں گی کہ جو عہد و پیمان ہمارے درمیان ہوئے وہ شادی کی معمولی رسم سے کہیں زیادہ متبرک اور استوار تھے۔ اگر مقدر نے وہ دن دکھایا کہ دارا شکوہ کو اس لڑائی میں فتح ہوئی اور بوندی کے راؤ راجہ چھتر سال کی جان سلامت رہی۔ تو اس نے عہد کیا تھا کہ وہ ہماچل کے سمت ایک دیوی کے مندر کی زیارت کو جائیگا اور وہاں جاکر جنگ و خونریزی سے توبہ کریگا۔

ہم دونوں اب روضہ سے واپس ہو رہے تھے اور الوداع کہنے کی گھڑی سر پر کھڑی تھی۔ میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ کہ "کیا میں بھی ہماچل کی زیارت گاہ کو جاؤں"؟ اس نے جواب میں کہا۔ "ہاں جہاں آرا بیگم میں ہماچل کے دامن میں تمہارا انتظار کروں گا۔ یا تو وہاں ملیں گے یا (اوپر کی طرف اشارہ کرکے) پھر اُس دُنیا میں"!

یہ آخری لفظ تھے جو اُس نے کہے۔ مقدر نہ تھا کہ میں پھر اس کی صورت دیکھتی!

باقی حصہ اس سوانح حیات کا معرکۂ جنگ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے ہمیں یہاں اُس سے سروکار نہیں۔ صرف اس قدر اضافہ کرنا بے محل نہ ہوگا کہ جنگ میں شکست ہونے کی خبر شاہجہاں اور بیگم جہاں آرا کو پہنچ چکی تھی۔ کہ بوندی کے راؤ راجہ چھتر سال کے رسالہ کا ایک سوار خاک و خون آلودہ کسی طرح سے جہاں آرا بیگم کے سامنے لایا جاتا ہے اور وہ جہاں آرا بیگم کی نشانی کا وہ گلوبند جو اس نے چھتر سال کو دیا تھا واپس سپرد کرکے یہ خبر دیتا ہے کہ چھتر سال اپنی بہادری اور وفا کا حق ادا کرکے رن میں نجابت خاں کی گولی سے مارا گیا۔

(پنڈت کشن پرشاد کول)

(نگار) جہاں آرا اور چھتر سال کی محبت کا یہ افسانہ جسے ہمارے عزیز دوست پنڈت کشن پرشاد صاحب کول نے انگریزی سے اخذ

اقتباس کر کے پیش کیا ہے۔ کوئی تاریخی اہمیت نہیں رکھتا۔ اور نہ اس نگاہ سے اسکا مطالعہ کرنا چاہئیے۔

پنڈت کشن پرشاد صاحب جب میرے پاس اس کو لائے تو یہ بھی بیان کیا کہ بعض رسائل نے اسکی طوالت کا عذر پیش کر کے اشاعت سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن جہانتک میرا خیال ہے یہ صرف بہانہ تھا۔ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ انہوں نے جہاں آرا کے متعلق اس قسم کا مضمون شائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے اسکی اشاعت صرف اس لئے منظور کر لی کہ اگر وہ کسی اور رسالہ میں شائع ہو گیا تو ممکن ہے اس کے خلاف تردیدی نوٹ درج نہ ہونے کیوجہ سے اس میں کوئی تاریخی اہمیت پیدا ہو جائے۔

اب چونکہ یہ مضمون ختم ہو گیا ہے اس لئے میں اس کی حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ اصل میں جہاں آرا کی نہ کوئی بیاض ہے جس سے یہ واقعات لئے گئے اور نہ اصل فرانسیسی مصنفہ میڈم بناتشاں نے اس کو اس نیت سے لکھا۔ بلکہ یہ صرف فرانسیسی انشاء پردازی کا ایک مخصوص انداز ہے تاکہ پڑھنے والوں پر اثر ڈالا جا سکے۔ اس میں شک نہیں کہ بناتشاں نے یہ ضرور لکھا ہے کہ قلعہ آگرہ میں سنگ مرمر کے کسی ٹوٹی ہوئی سل کے نیچے ایک بیاض اسکو ملی۔ لیکن اس ٹوٹی ہوئی سل سے مراد صرف مزار ہے۔ اور بیاض سے مراد وہ ہستی جو اس کے اندر مدفون تھی۔ اور کسی فسانہ کو اس نوع کے انداز بیان سے شروع کرنا فرانسیسی انشاء پردازی میں بہت عام ہے۔

اصل فرانسیسی کتاب کا ترجمہ انگریزی میں لارنس ہنین نے کیا ہے۔ اور اس نے بھی اپنے مقدمہ میں اس فسانہ کو کوئی تاریخی اہمیت نہیں دی۔

یہ میں اس لئے نہیں لکھ رہا کہ جہاں آرا کوئی معصوم فرشتہ تھی۔ اور اس کی طرف کسی واقعہ عشق و محبت کو منسوب کرنا کوئی گناہ ہے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ تاریخ سے مطلقاً اس واقعہ کی تصدیق نہیں ہوتی اور غیر تاریخی واقعہ کو تاریخی وقعہ کی صورت سے پیش کرنا یقیناً جرم ہے۔

مکتوبات نیاز کی بعض ظاہری خصوصیات

۱۔ ۲۸ پونڈ کے چکنے کاغذ پر نہایت نفیس چھاپی گئی ہے۔

۲۔ حضرت نیاز کی تازہ ترین تصویر اس میں شامل ہے

۳۔ ایک اصلی خط کا بلاک بھی دیدیا گیا ہے۔

۴۔ کتاب مجلد شائع کی گئی ہے۔

(منیجر نگار)

مصطفےٰ کمال اور جنگِ عظیم

(بسلسلۂ ما سبق)

جب مصطفےٰ کمال معرکۂ درۂ دانیال اور جنگ چونق بیر سے فاتحانہ طور پر فارغ ہوکر قسطنطنیہ واپس آیا۔ تو وہ خود بھی اپنی اہمیت کو زیادہ محسوس کرنے لگا۔ اور ملک کی نگاہیں بھی خصوصیت سے اس پر پڑنے لگیں۔ تمام اخبارات میں وہ "محافظِ درۂ دانیال" کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ اور اس کی عسکری شہرت بہت وسیع ہوگئی۔

وہ اربابِ حکومت جو پہلے اسکی کچھ سننا ہی نہ چاہتے تھے۔ اب اُس کی باتوں پر کان دھرنے لگے۔ اور حکومت کے انتظامی معاملات میں بھی وہ دخل دینے لگا تھا۔ وہ برابر علی الاعلان کہاکرتا تھاکہ ترکی کو ترکوں ہی کے ہاتھ میں رہنا چاہیے اور اگر جرمنی کے لوگ نوکر رکھے جائیں تو نوکروں کی طرح اُن کو دباکر رکھنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ عنانِ حکومت اُن کے ہاتھ میں دیدی جائے۔ اور چونکہ انور اپنی ناقابلیت کی وجہ سے ایسا نہیں کرسکتا۔ اس لئے اسکا وجود ملک کیلئے نہایت خطرناک ہے۔

اب رائے عامہ بھی اس کی طرف ہوتی جاتی تھی اور چونکہ جنگ کا جوش کم ہوتا جارہا تھا اس لئے اہلِ جرمنی کی طرف سے بھی لوگ بے پرواہ ہوگئے تھے۔ حتیٰ کہ ترکوں اور جرمنوں میں کئی بار جھگڑا بھی ہوگیا۔ اس میں شک نہیں کہ ترکی اس وقت بالکل جرمن مشین کا ایک حصہ ہوکر رہ گیا تھا۔ اور ہر شخص یہ سمجھتا تھاکہ جنگ میں کامیابی چاہے کسی کو ہو لیکن خسارہ ترکوں کو برداشت کرنا پڑیگا۔ ایک بار یہ سازش بھی ہوئی کہ تمام جرمن افسروں کو بیک وقت نکال باہر کردیا جائے۔ لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

اب انور بھی جو حقیقتاً بعض اہلِ جرمنی کی مدد سے ڈکٹیٹر بنا ہوا تھا۔ بدنام ہو رہا تھا۔ اور انجمن اتحاد و ترقی کے بھی بعض ممبر اس کے مخالف ہوگئے تھے۔ حتیٰ کہ اس کے خلاف سازشیں ہونے لگی تھیں۔ اور وہ اپنی جان کی طرف سے اتنا خائف رہتا تھا کہ بغیر باڈی گارڈ کے کہیں نہیں جاتا تھا اور اگر کبھی موٹر پر نکلتا تھا تو انتہائی تیز رفتاری کیساتھ۔

مصطفےٰ کمال کی جو رائے انور کے متعلق تھی وہ سب کو معلوم تھی۔ کیونکہ وہ جو کچھ کہتا تھا علانیہ کہتا تھا۔ اُس کے دوستوں میں سے ایک جمال تھا۔ جو اس وقت شام کی طرف تھا۔ اس لئے وہ طلعت کے پاس گیا جو اس وقت وزارتِ عظمیٰ

کے عہدہ پر ممتاز تھا - اور اس سے تمام حالات بیان کرکے دبی زبان میں گویا اسکا بھی اظہار کردیا کہ وزارتِ حربیہ کا چارج اس کو ملنا چاہئے - طلعت نے بظاہر تو اس کی موافقت میں گفتگو کی - لیکن اس کے چلے جانے کے بعد بہت ہنسا - اس کی خبر مصطفےٰ کمال کو بھی پہنچی - اور اس کی برہمی اور زیادہ بڑھ گئی -

مصطفےٰ کمال خلیل سے ملنے گیا جو امور خارجہ کا انڈر سیکرٹری تھا - اس نے نسیم بے وزیر خارجہ سے ملنے کا وقت مقرر کرادیا - جب مصطفےٰ کمال وہاں پہنچا تو وہ کسی کام میں مصروف تھا اور اس کو کافی انتظار کرنا پڑا - اس توہین سے اس کا غصہ اور بڑھ گیا - اور جب ملاقات ہوئی تو اس نے نہایت سختی سے کہا کہ جنرل اسٹاف کی طرف سے جو خبریں مل رہی ہیں بالکل غلط ہیں اور انور ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ وزارتِ حربیہ کا انچارج رہے - لیکن یہاں بھی اسے کامیابی نہ ہوئی - اور آخرکار لوگوں نے پھر اس کو پس پشت ڈال دیا - اصل سبب یہ تھا کہ مصطفےٰ کمال کے مزاج سے ہر شخص خائف تھا - اور لوگ جانتے تھے کہ اگر یہ برسرِ اقتدار ہوگیا تو پھر کسی کی نہیں سنے گا - کیونکہ اس میں اطاعت کرنیکا مادہ تھا ہی نہیں - اور دوسروں کو اپنے حکم کی تعمیل پر مجبور کرنا اس کی فطرت تھی -

اس وقت قسطنطنیہ سازشوں کا مرکز تھا - اور اب بچہ بچہ واقف ہوگیا تھا کہ مصطفےٰ کمال جرمنوں اور انور کا دشمن ہے - لیکن وہ خود کسی سازش میں حصہ نہیں لیتا تھا اور نہایت احتیاط سے کام لیکر بالکل علیحدہ رہتا تھا -

انھیں سازشوں میں سے ایک سازش انور کے خلاف اور مصطفےٰ کمال کے موافقت میں تھی - جس کا سرغنہ ایک شخص یعقوب جمال تھا - اس سازش میں فوج کے معمولی افسران دوسرے درجہ کے شامل تھے - انور بھی اس سے آگاہ تھا لیکن اس نے اسوقت تک ہاتھ نہیں ڈالا جب تک اس کو پوری شہادت نہیں مل گئی - وہ چاہتا تھا کہ مصطفےٰ کمال کے خلاف بھی کوئی ثبوت فراہم ہوجائے - لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی - اور یعقوب جمال اور اس کے بعض دیگر شرکار کو سولی دیدی گئی - مصطفےٰ کمال کی نسبت وہ سوائے اس کے کچھ نہ کرسکا کہ اس کو قسطنطنیہ سے ہٹا کر پہلے قاف اور پھر دیار بکر کے فوجی ہیڈکوارٹر میں تبدیل کردیا -

---

ایک سال قبل انور بے نے قاف کی طرف سے روسی فوجوں کے خلاف اقدام کیا تھا - لیکن اپنی ناتجربہ کاری اور وہاں کی موسمی حالت کا اندازہ نہ کرسکنے کیوجہ سے اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک لاکھ فوج میں سے صرف بارہ ہزار واپس آسکی اور باقی سب کی سب جنوری کا مہینہ آتے ہی سردی کیوجہ سے ٹھٹھر کر ختم ہوگئی - اس میں اناطولیہ کی فوجیں بھی تھیں - جو سارے ترکیہ میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتی تھیں - اس واقعہ کے بعد سے قاف کے محاذ کی طرف کسی کو توجہ نہ ہوئی - کیونکہ اس کے بعد درہ دانیال نے اپنی طرف سب کی توجہ مبذول کر رکھی تھی - اور روس آہستہ آہستہ بڑھ کر ارضِ روم تک پہنچ گیا -

اس وقت تک روسی فوجوں کی نقل و حرکت کا مرکز تمام تر جرمن محاذ تھا - لیکن اب وہ سارا زور ترکی کی طرف دینا

چاہتی تھی۔ چنانچہ گرانڈ ڈیوک نکولس روسی کمانڈر انچیف نے خود یہاں پہنچکر کمان اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔

مصطفےٰ کمال نے قاف پہنچکر ترکی فوج کی جو حالت دیکھی وہ حد درجہ مایوس کن تھی۔ نہ اسباب حرب موجود تھا۔ نہ سامان خورد و نوش۔ وردیوں کی حالت یہ تھی کہ گویا بدن پر چیتھڑے لپیٹ لئے ہیں۔ فوجی ٹھیکیدار افسران سے مل ملکر خوب چوریاں کر رہے تھے۔ اور بدنظمی انتہائی نقطہ تک پہنچ گئی تھی۔

مصطفےٰ کمال نے یہاں پہنچکر معلوم کیا کہ روسی فوجیں ۱۷ء کے موسم بہار تک جارحانہ اقدام شروع کرینگی۔ اور اگر اس وقت تک کوئی تدبیر مناسب نہ ہو سکی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ بلا مزاحمت پایۂ تخت تک پہنچ جائیں گی۔

مصطفےٰ کمال نے محکمۂ حربیہ کو تمام حالات سے ذریعۂ تار آگاہ کیا۔ اور لکھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو سامان حرب اور دوائیں روانہ کی جائیں۔ کیونکہ فوج میں بیماری بھی پھیل گئی تھی۔ جب اسکا کوئی جواب نہ ملا تو اس نے براہ راست انور کو تار دیا۔ لیکن اس طرف سے بھی خاموشی اختیار کی گئی۔ کیونکہ انور دوسری اسکیموں میں مصروف تھا اور قاف کے محاذ کو جو بہت دور واقع تھا کوئی اہمیت نہ دی جاتی تھی۔

اب مصطفےٰ کمال مجبور ہو گیا اور اس نے سوچا کہ جو کچھ کرنا ہے انھیں حالات میں کرنا ہے اور اس لئے اس نے سب سے پہلے ٹھیکیداروں کی طرف توجہ کی اور جس کی طرف سے ذرا بھی غفلت یا بے ایمانی ثابت ہوئی۔ اس کو فوراً قتل کرا دیا۔ اسی طرح کاہل افسروں کو نہایت سخت سزائیں دینی شروع کیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جمود میں کچھ حرکت پیدا ہوئی اور لوگ سوتے سے چونک پڑے۔ اس نے چیف آف اسٹاف عصمت کو مقرر کیا۔ اور کاظم قرہ باقر کو سیکنڈ کمانڈر۔ یہ دونوں آدمی ایماندار محنتی اور مطیع تھے۔ لیکن مصطفےٰ کمال ہنوز اس انتظام میں مصروف تھا کہ خوش قسمتی سے روس میں انقلابی تحریک پیدا ہو گئی اور روسی فوجیں درہم برہم ہو گئیں۔ مصطفےٰ کمال نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر آگے بڑھنا شروع کیا۔ اور بعض ترکی علاقے واپس لیکر باطوم کی طرف بڑھا۔ لیکن اس وقت جنوب کی طرف ایک نیا خطرہ پیدا ہوا یعنی شام کی طرف سے انگریزی فوجوں نے حملہ شروع کر دیا۔ اور قسطنطنیہ سے تار آیا کہ مصطفےٰ کمال فوراً شام روانہ ہو جائے۔ چنانچہ اس نے کاظم قرہ باقر کو چارج دیا اور روانہ ہو گیا۔

یہ نیا محاذ عراق و شام کا تھا۔ انگریز ایک طرف ہندوستانی فوج کی مدد سے بغداد پر قبضہ کرکے موصل کی طرف بڑھنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اور دوسری طرف فلسطین اور شام پر حملہ کرنے کے لئے مصر میں ایک زبردست فوج ترتیب دے رہے تھے۔

انور کی درخواست پر جرمن کمانڈر انچیف نے جنرل وان فالکنہین کو اُدھر بھیجدیا تاکہ وہ ایک جدید فوج مرتب کرے اور اس فوج کا نام یلدرم رکھا جائے۔ اس کا صدر مقام حلب قرار دیا گیا۔ اور بہت سے جرمن افسر اس میں شامل کئے گئے۔ مصطفےٰ کمال کو بھی رجمنٹ کا کمانڈر بنایا گیا۔ لیکن وہ جرمن اثر قبول کرنے پر تیار نہ تھا۔ لیمان وان ساندرس کیساتھ

تو خیر اس نے بناہ لی تھی - کیونکہ وہ آدمی معقول تھا - لیکن اس نئے جرمن کمانڈر کی طرف سے وہ بالکل غیر مطمئن تھا اور جانتا تھا کہ اس میں ترک افواج سے کام لینے کی صلاحیت مطلق نہیں ہے - جب جرمن کمانڈر اپنی بعض تدابیر میں ناکام رہا - تو اس نے ایک صندوقچہ اشرفیوں سے بھرا ہوا مصطفےٰ کمال کے پاس تحفتاً روانہ کیا - مصطفےٰ کمال نے یہ صندوقچہ لیکر اس کی باضابطہ رسید دیدی اور جب اسے واپس کیا تو اپنی رسید کی واپسی کا بھی مطالبہ کیا -

سب سے پہلا جلسہ اسٹاف افسران کا حلب میں ہوا - جس میں علاوہ جرمن افسروں کے انور - جمال اور مصطفےٰ کمال بھی شامل تھے - اس جلسہ میں جرمن کمانڈر نے مختلف تجویزیں پیش کیں - اور مصطفےٰ کمال نے سب پر اعتراض کیا - ان تدبیروں میں سے ایک تدبیر یہ بھی تھی کہ بغداد اور نہر سویز پر حملہ کیا جائے - مصطفےٰ کمال نے کہا کہ ان میں سے کوئی مہم کامیاب نہیں ہوسکتی - اس اختلاف پر جرمن کمانڈر کو بہت غصہ آیا - اور آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ مصطفےٰ کمال نے استعفا داخل کردیا - انور اور جرمن کمانڈر نے کوشش کی کہ وہ اپنا استعفا واپس لے لے - لیکن وہ نہیں مانا - اور اس نے بغیر انتظار منظوری اپنا چارج دوسرے کو دیدیا - جرمن کمانڈر نے چاہا کہ عدول حکمی کے جرم میں اسکا کورٹ مارشل کرے - لیکن انور نے اس کو مناسب نہیں سمجھا - اور پھر دیار بکر جانے کا حکم دیا - مصطفےٰ کمال نے وہاں جانے سے بھی انکار کردیا - اور بیماری کی رخصت لیکر قسطنطنیہ چلا گیا -

اب انور اور مصطفےٰ کمال کی باہمی مخالفت انتہا کو پہنچ چکی تھی - لیکن چونکہ انور کی کمان مصطفےٰ کمال کے مقابلہ میں سوزش گرتی جارہی تھی اور انور سمجھتا تھا کہ اگر کوئی کارروائی اس کے خلاف کی گئی تو ہنگامہ ہوجانے کا اندیشہ ہے - اس لئے وہ خاموش تھا اور خون کے سے گھونٹ پی پی کر رہ جاتا تھا -

مصطفےٰ کمال نے پیرا پیلیس ہوٹل میں ایک کمرہ لے لیا - اور وہیں رہنے لگا - اب یہ آزاد تھا اور پوری آزادی کے ساتھ حکومت کی پالیسی اور انور کی غلطیوں پر رائے زنی کیا کرتا تھا - اس دوران میں چونکہ لوگ جنگ سے بیزار ہوچکے تھے اور جرمن اثر بھی زائل ہوتا جارہا تھا اس لئے رفتہ رفتہ انور کے مخالفین مصطفےٰ کمال کے گرد جمع ہونے لگے -

انور اس فکر میں رہتا تھا کہ مصطفےٰ کمال کے کانٹے کو کس طرح دور کرے - اتفاقاً ۱۹۱۶ء میں شاہزادہ وحید الدین کا جرمنی جانا طے پایا - اور مصطفےٰ کمال انھیں کے ساتھ لگادیا گیا - مصطفےٰ کمال چونکہ تین مہینہ سے بیکار پڑا ہوا تھا اس لئے اس نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور یہ خدمت قبول کرلی - قسطنطنیہ اس وقت سازشوں کا آماجگاہ بنا ہوا تھا اور چونکہ تمام سازش کرنیوالے دوسرے درجہ کے لوگ تھے - اس لئے مصطفےٰ کمال ان کے ساتھ ملکر کوئی کام کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا - اور انور چونکہ وزیر حربیہ تھا اور فوج پر اپنا کافی اثر رکھتا تھا اس لئے اسکو ہٹانا آسان بھی نہ تھا -

روانگی سے دو دن قبل مصطفےٰ کمال، شاہزادہ وحید الدین کے حضور میں پیش کیا گیا - اسٹاف کے اور افسران بھی فراک کوٹ پہنے ہوئے منتظر تھے - تھوڑی دیر کے بعد وحید الدین داخل ہوئے اور ایک زرکار کرسی پر بیٹھ گئے -

مصطفےٰ کمال اُن کی صورت وضع دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جس قوم کے شہزادے ایسے ہوں اس کی تباہی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے ساٹھ سال کا ایک ضعیف انسان - لانبی خشک گردن - بیڈول جسم - چہرہ پر مردنی چھائی ہوئی - آنکھیں بند - قوتِ گویائی مفقود - مصطفےٰ کمال سمجھ گیا کہ خلیفہ عبدالحمید کی تربیت اور محل کے اندر ساٹھ سال تک اتاددا میں زندگی بسر کرنے کے بعد اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔

اسٹیشن پر شاہزادہ پہنچا تو سویلین لباس میں تھا اور گارڈ آف آنر کے پاس سے دونوں ہاتھوں سے سلام لیتا ہوا گذرا - مصطفےٰ کمال نے افسرِ تشریفات سے کہا کہ یہ کیا لغویت ہے - لیکن اس کی کسی نے نہیں سنی - اور اس سے کہا گیا کہ تم اب ڈویژن کے جنرل نہیں - بلکہ بریگیڈ کے جنرل ہو اور تمہارا نام سب سے اخیر میں لگایا گیا ہے۔ وہاں جاؤ - معمولی افسروں کا سا سلوک دیکھ کر مصطفےٰ کمال غصہ سے بیتاب ہوگیا - اور اسے افسوس ہوا کہ کیوں اس نے یہ خدمت منظور کرلی -

وحید الدین اس میں شک نہیں کہ بظاہر حد درجہ کاہل - سست - احمق - دیوانہ - نظر آتا تھا - لیکن فی الحقیقت وہ ایسا نہ تھا - محض خلیفہ عبدالحمید کے ڈر سے اس نے ایسی زندگی اختیار کی تھی - کہ جاسوسوں کو اس کے خلاف کچھ کہنے کا موقعہ نہ ملے - اور اب انور وغیرہ سے ڈرتا تھا - اندرونی طور پر وہ آزاد نہ تھا کہ سلطان بنے - لیکن انور کی پارٹی اس کے بھتیجے عبدالمجید کی طرفدار تھی اور اس لئے کوئی حرکت ایسی نہ کرتا تھا کہ کسی کو اسکی طرف سے شبہ پیدا ہو -

جب ترکی کے حدود سے ریل نکل گئی تو وحید الدین نے مصطفےٰ کمال کو بلایا اور یہ دیکھ کر حیران ہوگیا کہ وہی شخص جو چند گھنٹہ قبل بالکل سویا ہوا اور کھویا ہوا نظر آتا تھا اب نہایت ہوشیار و چالاک نظر آتا ہے۔ مصطفےٰ کمال نے جب اس سے گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ وہ خود بھی انور وغیرہ کا مخالف ہے - اس لئے مصطفےٰ کمال نے یہ سوچکر کہ موجودہ خلیفہ بہت ضعیف و بیمار ہے اور اس کے بعد یہی تخت نشین ہوگا نہایت تفصیل کیساتھ گفتگو کرکے اس کو بتایا کہ انور کی جماعت نے جرمن اثرات کو قبول کرکے ترکی قوم کی سخت توہین کی ہے - اور اس جنگ میں جرمنی کا کامیاب ہونا بالکل محال ہے -

مصطفےٰ کمال کی چال یہ تھی کہ اگر وحید الدین کو ابھی سے طرفدار کرلیا گیا تو تخت نشینی کے بعد وہی وزیر حربیہ بنایا جائیگا اور اس طرح اس کو کچھ کام کرنیکا موقع مل جائیگا - وحید الدین یوں تو مصطفےٰ کمال کی تمام باتوں سے بظاہر اتفاق کرتا تھا - لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر انور نہ رہا تو مصطفےٰ کمال کی گرفت اس پر اور زیادہ سخت ہوگی - اور وہ اندر ہی اندر اس فکر میں تھا کہ مصطفےٰ کمال کی مدد سے اپنے دشمن انور پر قابو حاصل کرلے اور پھر مصطفےٰ کمال کو بھی نکال باہر کرے -

جرمنی پہنچنے کے بعد ہنڈنبرگ سے ملاقات ہوئی اور اُس نے وحید الدین سے شام کے محاذ کا ذکر کرتے ہوئے بہت کچھ امیدیں دلائیں - لیکن مصطفےٰ کمال نے تنہائی میں وحید الدین کو سمجھایا کہ یہ سب دھوکا ہی دھوکا ہے اور میں

جانتا ہوں کہ شام کے محاذ کی جو تفصیلات بتائی گئی ہیں وہ بالکل غلط ہیں۔

بعد کو جب لوڈنڈرف سے ملاقات ہوئی تو اس نے زیادہ تفصیل کے ساتھ جرمن طیاروں کا ذکر کیا۔ یہ سنکر مصطفےٰ کمال سے نہ رہا گیا اور اس نے پوچھا کہ "تھوڑی دیر کے لئے اگر یہ مان لیا جائے کہ آپ کی یہ جارحانہ تدابیر کامیاب ہو جائیں تو بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کے بعد آپ کیا کرینگے۔ اور اس سے کیا فائدہ ہوگا"

فیلڈ مارشل نے کہا کہ "ہم ایک مقصد کو متعین کر لیتے ہیں۔ اور اس کے بعد نتیجہ کو حالات پر چھوڑ دیتے ہیں"

یہ سنکر مصطفےٰ کمال نے وحیدالدین سے کہا کہ "یہ حال ہے جرمن اسٹاف کے سب سے بڑے افسر کا کہ اسے بھی نتیجہ کی خبر نہیں اور صرف تقدیر کے بھروسہ پر کام کرنا چاہتا ہے"

قیصر کے یہاں ڈنر تھا اور یہی جنگ کی گفتگو جاری تھی کہ مصطفےٰ کمال نے کھڑے ہو کر نہایت آزادی سے ہنڈنبرگ کو مخاطب کر کے کہا کہ "آپ نے شاہزادہ وحیدالدین سے شام کے محاذ کے متعلق جو تفصیلات بیان کی ہیں۔ وہ بالکل غلط ہیں۔ میں چونکہ وہاں کام کر چکا ہوں اس لئے حالات سے واقف ہوں۔ اور جانتا ہوں کہ آپ نے سواروں کے جس ڈویژن کا ذکر کیا ہے وہ کاغذ پر موجود ہو تو ہو لیکن حقیقتاً اسکا وجود کہیں نہیں ہے۔ علاوہ اس کے یہ سب کچھ مان لینے کے بعد بھی یہ بتائیے کہ آپ کی ان تمام وسیع جارحانہ تدبیروں کا نتیجہ و مقصد کیا ہے"؟

ہنڈنبرگ ایک نوجوان افسر کے اس تیز و تند ریمارک کو سنکر خاموش رہا اور ان تمام سوالات کے جواب میں اس نے ایک سگریٹ مصطفےٰ کمال کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ جس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ تم ابھی بچہ ہو۔ میں تم سے کیا کہوں۔

ایک بار کسی افسر نے ترکی کے متعلق اچھے الفاظ استعمال نہ کئے۔ تو مصطفےٰ کمال اسی وقت بگڑ گیا۔ اسی طرح گورنر السا‌ک نے ایک بار ڈنر کے وقت کہا کہ اہل آرمینیا کے ساتھ ترکوں کا سلوک اچھا نہ ہوا۔ یہ سنتے ہی مصطفےٰ کمال کھڑا ہو گیا اور بولا کہ:۔

"ایسی گفتگو ایسے شاہزادہ سے کرنا جو ہنوز تخت نشین نہیں ہوا۔ بالکل نامناسب ہے۔ آپ کو آرمینیا اور آرمینیا والوں کی کیا خبر۔ اول تو یونہی ترکی نے جرمن کے ساتھ اتحاد کر کے اپنے آپ کو کافی نقصان پہنچایا ہے اور اب آرمینیا کی موافقت میں ترکی کے خلاف اظہار رائے کر کے اس نقصان پر توہین کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ کیا جرمنی اس سے واقف نہیں کہ آرمینیا ترکی کا کتنا سخت دشمن ہے"

یہ سنکر گورنر نے معذرت کی اور بات ٹال دی۔

جب یہ سیاحت ختم ہوئی اور جرمنی سے واپسی کا وقت آیا۔ تو مصطفےٰ کمال نے ایک بار پھر وحیدالدین کو تمام نشیب و فراز سمجھا کر کہا کہ "میں آپ کو ایک تدبیر بتاتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ آپ کسی فوج کی کمان طلب کیجئے۔ ترکی کے شاہزادوں نے ہمیشہ فوجوں کی قیادت کی ہے اور پھر مجھے چیف آف اسٹاف کی حیثیت سے لے لیجئے"

وحیدالدین نے پوچھا۔ "کس فوج کی کمان طلب کروں"؟

مصطفےٰ کمال نے کہا کہ "پانچویں کی"

وحید الدین :- "لیکن وہ مانیں گے نہیں"

مصطفےٰ کمال :- "کچھ پروا نہیں - کم از کم اس سے ان کو یہ تو معلوم ہو جائیگا کہ آپ کے جذبات کیا ہیں"

وحید الدین :- "بہتر ہے - میں قسطنطنیہ واپس پہنچکر اس پر غور کروں گا"

وحید الدین نے یہ کہنے کو تو کہہ دیا - لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر کسی فوج کی کمان اسے مل گئی اور اس نے مصطفےٰ کمال کو چیف آف اسٹاف بنا لیا - تو پھر جو کچھ وہ چاہیگا وہی ہوگا - اور انور سے زیادہ سخت گیر ثابت ہوگا -

---

قسطنطنیہ پہنچکر مصطفےٰ کمال سخت بیمار ہو گیا گردوں کا مریض تھا اور اکثر درد کے دورے اس پر پڑا کرتے تھے - تبدیل آب ہوا اور علاج کے لئے یہ پہلے وائنا گیا اور پھر کارلسباد - اس دوران میں سلطان کا انتقال ہو گیا - اور وحید الدین تخت نشین ہوئے - قسطنطنیہ سے بہت سے خطوط لوگوں کے آئے کہ وہ لوٹ آئے - لیکن وہ نہ جاسکا - اور صرف ایک تار مبارکباد کا وحید الدین کو بھیجکر خاموش ہو گیا - اس وقت عزت پاشا جو انجمن اتحاد و ترقی اور انور کا سخت دشمن تھا - سلطان کا ایڈیکانگ تھا اور انور کے خلاف کارروائیاں شروع ہو گئی تھیں - عزت پاشا نے بھی مصطفےٰ کمال کو خط لکھ کر اصرار کیا کہ جس قدر جلد ممکن ہو قسطنطنیہ پہنچ جائے - آخر کار وہ جولائی ۱۹۱۸ء میں کسی نہ کسی طرح قسطنطنیہ پہنچ گیا - اور یہاں آتے ہی اس کے تمام ولولے عود کر آئے -

خلیفہ وحید الدین نے مصطفےٰ کمال کو بلایا - اور انتہائی بے تکلفی اور محبت سے پیش آیا - یہانتک کہ خود اپنے ہاتھ سے دیا سلائی جلا کر اسکا سگریٹ روشن کیا - مصطفےٰ کمال نے اس خلوص سے متاثر ہو کر دل کی تمام باتیں اس سے کہدیں - اور اسکو سمجھایا کہ جب تک انور اور جرمن افسروں کا اقتدار باقی ہے - ترکی تباہی سے نہیں نکل سکتا - اس لئے ضرورت ہے کہ انور کو فوراً علیحدہ کر دیا جائے اور مجھے اسکی جگہ مقرر کیا جائے"

اس کے بعد اور کئی ملاقاتیں ہوئیں اور جب آخری ملاقات میں مصطفےٰ کمال نے زیادہ جوش و قوت کے ساتھ اس مسئلہ پر گفتگو کی تو وحید الدین نے تھوڑی سی برہمی کے ساتھ جواب دیا کہ "میں انور اور طلعت سے مفاہمت کر چکا ہوں" - اور یہ کہہ کر مصطفےٰ کمال کو رخصت کر دیا -

یہ سننے کے بعد اس کے پیچ و تاب کا جو عالم ہوا ہوگا - ظاہر ہے - بات یہ تھی کہ انور نے خلیفہ وحید الدین کو پوری طرح ڈرا دیا تھا کہ اگر کسی قسم کی مخالفت کا اظہار کیا گیا تو فوراً تخت سے اتار دیئے جائیں گے - خلیفہ نے اپنے داماد فرید پاشا سے مشورہ کیا تو اس نے بھی یہی کہا کہ انجمن اتحاد و ترقی کا مقابلہ آسان نہیں - الغرض خلیفہ وحید الدین نے اپنے کسی وعدہ کا خیال نہ کیا - اور مصطفےٰ کمال کو صاف جواب دیدیا - وہ یہ سمجھتا تھا کہ درپردہ یہ سب انور ہی کا کیا ہوا ہے اور غصہ کے مارے اپنے ہونٹ چبا رہا تھا -

اس واقعہ کے دو ہفتہ بعد سلاملق کے بعد خلیفہ نے مصطفےٰ کمال کو طلب کیا۔ تمام اسٹاف اور جرمن افسران بھی موجود تھے۔ جس وقت مصطفےٰ کمال وہاں پہنچا تو سلطان نے نہایت محبت و خلوص سے اسکا خیر مقدم کیا۔ اور حاضرین سے اسکا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ "یہ مصطفےٰ کمال پاشا ہے جو ٹرکی فوج میں سب سے زیادہ قابل جنرل ہے اور مجھے اس پر کامل اعتماد ہے۔" اس کے بعد مصطفےٰ کمال سے مخاطب ہو کر کہا کہ "ایکسیلنسی، میں تمہیں شام کے محاذ پر مامور کرتا ہوں جو اس وقت نہایت ہی مہتم بالشان محاذ ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم دشمنوں کے ہاتھ میں اس حصہ ملک کو نہ جانے دو گے۔" یہ کہکر مصطفےٰ کمال کو رخصت کر دیا۔

دوسرے کمرہ میں افسروں کا ہجوم تھا۔ جن میں بہت سے جرمن افسر بھی شامل تھے۔ جب مصطفےٰ کمال اس کمرہ سے گذرتا ہوا انور کے قریب پہنچا تو ٹھہر گیا۔ اور کچھ دیر تک نہایت خاموشی سے اسکو دیکھ کر بولا کہ "انور، شاباش، میں اس کامیابی پر تم کو مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ شام کے محاذ کا کیا حال ہے اور وہاں کتنی فوج جمع ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ تم اس سے بہتر کوئی انتقام مجھ سے نہ لے سکتے تھے۔"

اسی وقت ایک جرمن افسر بول اٹھا کہ "ترکی فوج تو جانوروں کے گلے ہیں جن کو بھاگنے کے سوا کچھ نہیں آتا۔ اس لئے اسکا کمانڈر جو کوئی بھی ہو۔ رشک کے قابل نہیں۔"

یہ سنتے ہی مصطفےٰ کمال بھڑک گیا۔ اسکی آنکھیں غصہ سے سرخ تھیں۔ بال کھڑے ہو گئے تھے۔ اس نے نہایت بلند آواز سے کہا:۔

"میں بھی سپاہی ہوں۔ میں نے بھی فوج کو کمانڈ کیا ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ ترکی سپاہی سب کچھ کر سکتا ہے۔ لیکن بھاگنا اسکو نہیں آتا۔ اس لئے اگر تم نے کبھی کسی ترک سپاہی کی پیٹھ دیکھی ہوگی تو صرف اس وقت جب اس نے پہلے تمہاری پیٹھ دیکھ لی ہوگی۔ حیرت ہے کہ اپنی بزدلی کا الزام ترک فوج پر رکھتے ہو۔"

سارے مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ اور مصطفےٰ کمال سب کو اسی طرح خاموش و حیران چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

مصطفےٰ کمال شام کے محاذ پر اخیر اگست میں پہنچا۔ اور لیمان وان ساندرس کے پاس حاضری دی۔ جو اس محاذ کا کمانڈر انچیف تھا۔ چونکہ ساندرس سے اس کے تعلقات اچھے تھے۔ اس لئے اسکو غنیمت جانا کہ کسی اور جرمن افسر کے ساتھ ملکر اس کو کام کرنا نہیں ہے۔ اس نے جنرل فوزی سے فوج کا چارج اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور تمام محاذ کا معائنہ کرکے وہ بہت مایوس ہوا کیونکہ فوج کی حالت حد درجہ خراب و خستہ تھی۔ اور ہزاروں پیچش و بخار میں مبتلا تھے۔ نہ کھانے کو ملتا تھا نہ پہننے کو۔ دوا کا کیا ذکر کہ اس ریگستان میں پانی بھی میسر نہ آتا تھا۔ خندقوں میں پڑے ہوتے تھے۔ اور موت کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے مقابلہ میں انگریزی فوج ہر لحاظ سے نہایت بہتر حالت میں تھی جس میں امیر فیصل بھی شریک ہو گیا تھا۔ لارنس کمانڈر تھا اور

برابر ریلوے لائن۔ تار اور ٹیلیفون کاٹتا ہوا آگے بڑھتا آ رہا تھا۔ اور ملک میں سخت بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔

مصطفٰی کمال ایک بار پھر ہمت کرکے فوج کی تنظیم کی طرف متوجہ ہوا۔ لیکن اتفاق سے درد گردہ نے پھر اسکو صاحب فراش کر دیا۔ اور کامل دو ہفتہ بیکار پڑا رہا۔ وہ سن رہا تھا کہ انگریزی فوج حملہ کرنے ہی والی ہے۔ اور اپنی بے دست وپائی دیکھ دیکھ کر ہونٹ کاٹ رہا تھا۔

۱۷۔ ستمبر کو ایک ہندوستانی سارجنٹ انگریزی فوج سے بھاگ کر اس طرف آ گیا۔ اور اس نے کہا کہ ۱۹۔ کو حملہ شروع ہوگا۔ یہ خبر رفتہ رفتہ مصطفٰی کمال کو پہنچی۔ اس نے عصمت اور علی فواد کو بھی بلایا۔ اور باہم مشورہ کے بعد یہ قرار پایا کہ یہ خبر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اور بحالات موجودہ جس طرح ممکن ہو مدافعت کرنی چاہیئے۔ جرمن کمانڈر سانڈرس متفق نہیں تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ہندوستانی سارجنٹ صرف دھوکا ہی دھوکا ہے۔ لیکن چونکہ مصطفٰی کمال کو یقین ہو چکا تھا اس لئے وہ کسی نہ کسی طرح بستر سے اٹھا۔ درد موجود تھا۔ اور بخار بھی۔ لیکن فطرت نے قوت عزم اس کو اتنی زبردست دی ہے کہ جب وہ کسی بات کا ارادہ کر لیتا ہے تو پھر دنیا کی کوئی چیز اسے باز نہیں رکھ سکتی۔ اس نے اسی حالت بیماری میں تمام افسروں کو بلایا۔ ان کو مناسب ہدایات دیں اور خود ہر جگہ پہنچکر مختلف مقامات کا معائنہ کرکے فوج کی ہمت بڑھائی۔

آخر کار ۱۹۔ کو انگریزی فوج کا حملہ شروع ہوا اور سیلاب کی طرح آگے بڑھنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی فوج منتشر ہو گئی۔ اور مصطفٰی کمال کو دمشق تک پیچھے ہٹنا پڑا۔ لیکن فوراً ہی اس نے محسوس کیا کہ یہاں بھی ٹھہرنا خطرہ سے خالی نہیں۔ اس لئے اس نے جنرل سانڈرس سے کہا کہ اب سوائے اس کے کوئی ترکیب نہیں کہ شام دشمن کے حوالہ کرکے حلب میں محاذ قائم کیا جائے۔ سانڈرس نے کہا کہ "میں ایسا حکم نہیں دے سکتا۔ کیونکہ لوگ یہی کہیں گے کہ چونکہ جرمنی کا آدمی تھا اس لئے اس نے ترکی کا اتنا حصہ ملک کا چھنوا دیا۔"

مصطفٰی کمال نے کہا کہ "میں خود اپنی ذمہ داری پر کرونگا۔ تم فکر نہ کرو۔" اور اس نے حلب کا راستہ اختیار کیا۔

یہاں پہنچکر اس نے پھر از سر نو فوج کو مرتب کیا۔ اور خلیفہ کو تار دیا کہ "انور کو نکال کر موجودہ نظام حکومت فوراً بدل دینا چاہیئے۔" اسکا کوئی جواب تو نہ ملا۔ لیکن یہ خبر اس کو پہنچ گئی کہ انور طلعت اور جمال بھاگ کر بحیرۂ اسود کی طرف چلے گئے ہیں۔ اور رؤف دفوزی کی مدد سے دوسری وزارت ترتیب دی گئی ہے۔

اس طرف کرنل لارنس نے مصطفٰی کمال کو لکھا کہ وہ ترکی حکومت پر زور ڈالے کہ ہم سے علیحدہ صلح کی گفتگو کرے مصطفٰی کمال نے کہلا بھیجا کہ میں جنگ کرونگا۔ صلح کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

۲۶۔ اکتوبر کو انگریزی فوج نے دوبارہ حملہ کیا۔ لیکن اس جنگ میں مصطفٰی کمال نے ایسی غیر معمولی جرأت و ہمت سے کام لیا کہ جودھپور اور میسور کے دو رسالوں کو اس نے دم میں ختم کر دیا۔ اور انگریزی فوجیں پسپا ہو گئیں۔ لیکن اس

جنگ کا کوئی نتیجہ نکلا تھا کہ صلح کی اطلاع آگئی۔ اور سانڈرس مصطفےٰ کمال کو چارج دیکر واپس گیا۔

مصطفےٰ کمال باوجود اطلاع صلح کے فوجی تنظیم میں لگا ہوا تھا۔ تاکہ اگر پھر جنگ کی نوبت آئے تو وہ اس کے لئے تیار پایا جائے۔ لیکن اسی وقت عزت پاشا کا تار آیا کہ توفیق پاشا جو انگریزوں کا دوست ہے وزیر اعظم ہونیوالا ہے اس لئے فوراً یہاں پہنچو۔ تمہاری مدد کی سخت ضرورت ہے۔" یہ خبر پاتے ہی مصطفےٰ کمال سیدھا قسطنطنیہ روانہ ہوگیا۔

نوٹ:۔ اس کے بعد سلسلہ کے لئے دیکھئے ماہ نومبر ۳۴ء کا نگار اور اس کے بعد کے پرچے۔

مجموعۂ استفسار و جواب جلد دوم

کی کتابت شروع ہوگئی ہے اور اس جلد میں اسوقت تک کے تمام استفسار و جواب شامل کر دیئے جائیں گے تاکہ تیسری جلد کی ضرورت نہ رہے اسکا حجم غالباً ایک ہزار صفحہ سے کم نہ ہوگا قبل اشاعت اسکی رعایتی قیمت چار روپیہ مع محصول رکھی گئی ہے۔

منیجر نگار

بہار

مؤلفہ الیاس احمد ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ منصف سہارنپور

گلدستۂ "بہار" فارسی اور اردو شعراء کے چوٹی کے کلام خصوصاً غزلوں کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے۔ یا یوں سمجھیے کہ "در زبان شاعراں" "حسن و عشق کی مکمل داستان ہے۔ اس داستان کے "آغاز عشق" سے لیکر "انجام عشق" تک جتنے عنوانات قایم ہو سکتے ہیں قایم کئے گئے ہیں۔ اور ہر عنوان کے تحت میں چیدہ چیدہ متحدالمضامین اشعار درج ہیں۔ عنوانات سینکڑوں ہیں۔ اس گلدستہ کے ہوتے ہوئے شاید ہی کسی کے دیوان کی ضرورت ہو علم ادب میں یہ گلدستہ ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت مع محصول ایک روپیہ۔ ضخامت ۲۳۶ صفحات۔

ملنے کا پتہ:۔ منیجر صاحب۔ دار المصنفین اعظم گڑھ۔ یو۔ پی

جھانسی کی رانی

تاریخ حکومت برطانیہ ہند میں لارڈ ڈلہوزی کا زمانہ اتنا اہم بالشان زمانہ گذرا ہے کہ اگر ہم اسے اساسِ حکومت سے تعبیر کریں تو غالباً غلط نہ ہوگا - پنجاب، برہما، سکم، ستارہ، جلپور وغیرہ تمام ریاستوں کا اسی کے زمانہ میں برٹش راج سے الحاق ہوا - اور جھانسی کی مرہٹہ ریاست بھی اسی نے ہمیشہ کے لئے ختم کی -

ہندوستان میں "جھانسی کی رانی" اتنا مشہور اور زبان زد فقرہ ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو اس سے واقف نہ ہو - لیکن شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مرہٹہ تاریخ میں "جھانسی کی رانی" کیا اہمیت رکھتی ہے - اور اس نے کس جرأت و ہمت سے کام لیکر اپنے وطن پر اپنے آپ کو قربان کر دیا - یہ ڈرامہ مسٹر فلپ کاکس کا لکھا ہوا ہے اور جارج الن اینڈ ان ون لندن نے اسے شائع کیا ہے - ہم ممنون ہیں کہ انہوں نے اس کے ترجمہ کی اشاعت کی اجازت دیکر ہمیں اس ادبی خدمت کا موقعہ دیا -

نیاز

افرادِ تمثیل

ماما صاحب :- رانی لکشمی بائی کا باپ

نر سنگھ :- گنگا دھر راؤ سابق راجہ جھانسی کا دیوان

لالہ لاہوری مل و لالہ ٹھٹی چند :- راجہ گنگا دھر راؤ کے دو اور وزراء

انند راؤ :- گنگا دھر راؤ کا متبنّیٰ ولیعہد

راؤ آپا - ایک مرہٹہ خادم

رانی لکشمی بائی - راجہ گنگا دھر راؤ کی بیوہ رانی

گنگا بائی - گنگا دھر راؤ کی پہلی رانی

میجر ایلیس - ۱۸۵۴ء میں بندھیلکھنڈ کا انگریزی پولیٹکل افسر

میراں بائی - رنواس کی رقاصہ

جے اے ڈورین } ۱۸۵۴ء میں گورنر جنرل کی اگزیکیٹو کونسل

فریڈ جے ہیلیڈے } کے دو ممبر

جے پی گرانٹ - لارڈ ڈلہوزی کے عہد میں گورنمنٹ آف انڈیا کا سیکرٹری

کرنل جان لو - ۱۸۵۳ء میں گورنر جنرل کی اگزیکیٹو کونسل کا تیسرا ممبر **ملٹری سیکرٹری** - فوجی مشیر متعینہ گورنمنٹ ہاؤس کلکتہ ۱۸۵۳ء

لارڈ ڈلہوزی - ہندوستان کا گورنر جنرل ۱۸۴۸ء لغایتہ ۱۸۵۶ء **بخشش علی** - ۱۸۵۷ء میں جھانسی کا داروغہ جیل

جمعدار لال بہادر :- ہندوستانی فوج کی بارھویں رجمنٹ کے باغی سپاہیوں کا لیڈر

رسالدار لال محمد - ۱۴ بے قاعدہ رسالہ کے باغی سواروں کا لیڈر۔ **جنرل سر ہیو روز** - انگریزی فوج کا سپہ سالار

دیگر افراد - محافظ سپاہی - پہلوان، نٹ - بھان متی - خادمائیں - اہل شہر - اکابر شہر - مرہٹہ و پٹھان سپاہی - لشکری - شکاری - شاگرد پیشہ - اور گورے سپاہی

مرکزی اردو کتب خانہ
اردو ہال - حیدر گوڑہ
حیدر آباد - ۱

۱۸۵۳ء

پہلا ایکٹ - پہلا منظر

۲۴ - دسمبر ۱۸۵۳ء وقت سہ پہر - قلعہ جھانسی کے مغربی سمت رانی لکشمی بائی کا خانہ باغ ایرانی وضع کا - ہر طرف امن و سکون ہے - دو طرف قلعہ کی بلند دیوار پردہ کا کام دیتی ہے - تیسری طرف داہنے ہاتھ کو جہاں زمین کچھ بلند ہے - املی کے درختوں کے آغوش میں راجہ کا محل ہے - بائیں طرف قلعہ کی دیوار کے قریب ایک زینہ ہے جو مہادیوجی کے مندر کو جاتا ہے - یہ مندر باغ کے بائیں سمت نظروں سے پوشیدہ قلعہ کی دیوار کی آڑ میں ہے - زینہ کی سیڑھیوں کا سلسلہ مندر کے ایک گوشہ میں ختم ہوتا ہے - اور یہ زینہ صرف رنواس کی گذرگاہ ہے - باغ کے وسط میں فوارہ چھوٹ رہا ہے - ایک طرف ایک خوبصورت چوبی تخت ہے جس پر ایک قیمتی زرکار شامیانہ تنا ہوا ہے - تخت پر نہایت بیش قیمت گدے اور گاؤ تکیے بچھے ہوئے ہیں - تخت کے پائیں دو تین تپائیاں نظر آتی ہیں -

رانی لکشمی بائی کا باپ ماما صاحب اور نرسنگھ وزیر اعظم بائیں طرف زینہ سے داخل ہوتے ہیں - یہ دونوں ادھیڑ عمر کے ہیں - ماما صاحب فربہ اور تنومند سپاہیانہ وضع میں نظر آتا ہے - نرسنگھ ضعیف الجثہ ہے اور اس کی کمر کسی قدر جھکی ہوئی ہے - چہرہ پر ایک قسم کی متانت بلکہ مکاری برستی ہے - دونوں شمالی ہندوستان کے ہندوؤں جیسا سفید لباس پہنے ہیں - سر اور پاؤں ننگے ہیں - یہ مہادیوجی کے مندر سے پوجا کر کے

نکلے ہیں۔ باغ میں خراماں خراماں چلتے ہوئے کہیں کہیں رُک جاتے ہیں۔ آپس میں باتیں ہو رہی ہیں)

ماما صاحب:۔ میں تو صاف کہتا ہوں۔ جب تک رانی کی صحبت میں گنگا بائی رہیگی۔ اس وقت تک جھانسی راج کے متعلق ہماری کوئی تمنا پوری نہیں ہو سکتی۔ ایشور جانے وہ کونسا منحوس دن تھا جب ہم نے گنگا بائی کو لکشمی کا سہیلی بننے دیا۔ در حقیقت مجھ سے یہی حماقت ہوئی۔ کاش میں جانتا کہ شادی بیاہ کے بعد بھی لڑکیوں کی نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر گنگا بائی کا اثر نہ ہوتا تو مجال تھی کہ لکشمی مجھ سے، اپنے پتا سے اس طرح پھر جاتی۔ اور مجھ سے ایسا برتاؤ کیا جاتا۔ اگر مہاراجہ زندہ ہوتے تو میں لکشمی کو ٹھیک بنا دیتا۔ لیکن کیا کروں مجبور ہوں۔ ابھی ابھی مندر میں جب ہم پوجا کر رہے تھے۔ پرماتما جانے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا راجہ جی ہمارے پاس کھڑے ہوئے ہیں۔

نرسنگھ:۔ بات یہ ہے کہ آجکل رانی سوگ میں ہیں۔ اور ان کو دل بہلانے کے لئے ہر وقت سہیلیوں کی ضرورت رہتی ہے ورنہ ایسی تدبیریں کی جا سکتی تھیں کہ گنگا بائی کو اس کے میکے بھیجدیا جاتا۔

ماما صاحب:۔ (اظہار شک کیساتھ سر ہلاتے ہوئے) لیکن اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔ لکشمی روز بروز ہاتھوں سے نکلتی جاتی ہے۔ تم نے تو دیکھا ہوگا کہ کل وہ کتنی برہم ہوئی تھی کہ میں مہاراجہ کی وصیت کے مطابق اس کے نائب فرمانروا تسلیم کئے جانے پر کیوں زور نہیں دیتا۔ اس نے صاف صاف کہدیا کہ میں نے اور وزیر نے کیساتھ ساز باز کر رکھی ہے تاکہ وہ اپنی جائز پوزیشن حاصل نہ کر سکے۔

نرسنگھ:۔ عورت کے دل کی تھاہ کو پہنچنا اور ریگستان میں پانی ڈھونڈھ نکالنا۔ دونوں برابر ہیں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ جو لوگ ریاست کے معاملات سمجھتے ہیں انھیں پر تمام انتظامات چھوڑ دیئے جائیں۔ مگر رانی صاحبہ یہ چاہتی ہیں کہ ریاست کا تمام نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ میری سمجھ میں تو آتا نہیں۔

ماما صاحب:۔ (جھڑک کر) سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔ یہ جو کچھ ہے سب گنگا بائی کا کیا دھرا ہے۔ وہ ہر وقت ملکہ وکٹوریہ اور رانی اہلیہ بائی کے گیت گاتی رہتی ہے۔ جب عورتیں اپنی ہی صنف کے ہیرو اس طرح کھڑے کرتی رہیں گی تو ہم مردوں کا خدا حافظ ہے

{عین اسی وقت راج کے دو اور وزیر لالہ لاہوری مل اور لالہ ٹیک چند داہنی طرف سے نکل کر مندوانہ طریقہ سے ماما صاحب اور نرسنگھ کو سلام کرتے ہیں۔ یہ متمول طبقہ کے دو ادھیڑ برہمن ہیں۔ اور سفید لباس میں ملبوس}

لاہوری مل:۔ اچھا ہوا آپ لوگ یہاں مل گئے۔ میجر ایلس صاحب یہاں آگئے ہیں۔ اور قلعہ کے افسروں سے باتیں کر رہے ہیں۔ ہمارے یہاں کے جیلخانہ میں قیدیوں نے جو لگاتار ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ اس سے سرکار انگریزی سخت متردد ہے۔ اور اس نے میجر صاحب کو بھیجا ہے تاکہ تفتیش حالات کر کے رپورٹ کریں۔

ٹیک چند:۔ ہم دونوں نے خیال کیا کہ یہ موقعہ اچھا ہے۔ میجر صاحب سے معلوم کر لیا جائے کہ ہم نے کمار انند راؤ کی متبنیت تسلیم کئے جانے کے متعلق کلکتہ میں اپیل کی تھی۔ اسکا کیا حشر ہوا۔ ہم لوگ یہی کہنے یہاں آئے ہیں۔

نرسنگھ:۔ (خوش ہو کر) شکریہ! دونوں بھائیوں کا شکریہ۔!! آپکا خیال بہت درست ہے۔

ماما صاحب:۔ (جوش کیساتھ داہنی طرف کو ہٹکر) ۔ اچھا تو چلو۔ دیکھیں میجر صاحب کیا کہتے ہیں۔ اب تک کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہوگا۔

{ چاروں جلدی جلدی قدم بڑھاکر داہنی طرف نظروں سے غائب ہوجاتے ہیں۔ بائیں جانب سے کمار انند راؤ ولیعہد متبنیٰ اور راؤ آپا مرہٹہ داخل ہوتے ہیں۔ انند راؤ ایک چست چالاک اور قبول صورت سات سال کا لڑکا ہے۔ سفید لباس پہنے ہے۔ دونوں ہاتھ میں ہاتھ پکڑے زینہ سے اُترتے ہیں۔ باغ میں داخل ہوتے ہی انند راؤ کودتا پھاندتا الگ ہوجاتا ہے۔ }

آنند راؤ:۔ راؤ آپا آؤ۔ اور دو دو ہاتھ تلوار کے نکالیں۔ آؤ! لپک کر آؤ۔ محلسرائے میں چلیں۔ اور رانی صاحبہ کو اچانک جا گھیریں۔

راؤ آپا:۔ اچھا کنور صاحب۔ چلئے۔ تشریف لے چلئے!

{ انند راؤ داہنی طرف دوڑتا جاتا ہے۔ اور راؤ آپا پیچھا کرتا ہے۔ بائیں طرف کے زینہ سے رانی لکشمی بائی باغ میں داخل ہوتی ہے۔ ساتھ میں گنگا بائی بھی موجود ہے۔ رانی صاحبہ سفید رنگ کی قیمتی ساڑھی پہنے ہوئے ہیں۔ جسم پر بیش قیمت سفید کپڑے کی چولی ہے۔ سر اگرچہ ساڑھی سے ڈھکا ہوا ہے۔ لیکن سوگ کیوجہ سے منڈوا دیا گیا ہے۔ پاؤں برہنہ ہیں۔ جسم پر کوئی زیور نہیں ہے۔ یہی حالت گنگا بائی کی ہے۔ مگر اس کا سر منڈا ہوا نہیں ہے۔ رانی بمقابلہ گنگا بائی کے زیادہ کشیدہ قامت، جوان اور حسین ہے۔ رفتار و گفتار حرکات و سکنات سے شاہی شان و شوکت ظاہر ہوتی ہے۔ دونوں مندر میں پوجا کرکے باہر آئی ہیں۔ رانی لکشمی بائی آگے آگے اور گنگا بائی پیچھے ہے۔ }

رانی:۔ (طنزیہ لہجہ میں) گنگا بائی! جو تمنا میرے دل میں ہے اسے اور کوئی دیوتا تو کیا خود مہادیوجی بھی شاید پوری نہیں کرسکتے۔ اس دنیا میں جہاں مردوں کی حکومت ہے۔ کسی عورت کا جنم لینا کس قدر تکلیف دہ بات ہے۔ ایک عورت جانتی ہے کہ اسکا کیا حشر ہوتا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اس میں کس قدر زبردست طاقتیں ہیں۔ بایں ہمہ وہ اس چیز کی جستجو میں نہیں نکل سکتی جو اسے آگے قدم بڑھانے کے لئے اشارہ کررہی ہے۔

(مسند پر جاکر بیٹھ جاتی ہے اور پاؤں سمیٹ لیتی ہے اور گنگا بائی ایک تپائی پر بیٹھ کر رانی کے پاؤں دابنے لگتی ہے)

گنگا بائی:۔ اگر مہارانی کی خواہش یہی ہے تو انسان تو کیا دیوتا لوگ بھی آپ کی خواہش پوری ہونے سے نہیں روک سکتے۔

رانی:۔ بہن ایک مہاتما کی خواہشِ آزادی سے ایک بے یار و مددگار عورت کی آرزو سے مختلف ہوتی ہے دنیا سے بچنے کے لئے مرد تو مذہب کے دامن کی پناہ لے لیتے ہیں۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) مگر ہم عورتوں کو مذہب کی اس لئے ضرورت ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہم کو ایسی الہامی ہدایات حاصل ہوتی رہیں۔ جو گرد و پیش کے تمام آلام و مصائب کے بھنور سے ہماری

کشتیٔ حیات کو نکال کر ساحلِ مراد تک پہنچادیں۔ (جوش میں) جب کبھی مجھے اس بات کا خیال آتا ہے کہ اہلیہ بائی نے کس طرح تیس برس تک مسلسل کوشش کرکے، ریاست اندور میں امن و امان بحال رکھا۔ اور دھرم شاستر کا جو علم اسے حاصل تھا اس سے کام لیکر وہ قلمرو نے ہولکر میں کس طرح امن و امان اور خوشحالی قائم رکھ سکی۔ تو میں شرم و غیرت سے زمین میں گڑ جاتی ہوں۔ کیونکہ میں بھی اسی طرح جھانسی راج کو بچانا چاہتی ہوں مگر میرے تمام منصوبوں کو خاک میں ملایا جارہا ہے۔

گنگا بائی:۔ مہارانی! اگر کسی چیز کے بچانے کی ضرورت ہے تو وہ جھانسی راج ہے۔ میرے سورگباش پتاجی کہا کرتے تھے کہ راجہ رامچندر راؤ کے زمانہ میں جتنے مالگذار تھے سب راج کے قرضخواہ تھے۔ اور حالت یہ ہوگئی تھی کہ تمام ریاست قرضوں کے بوجھ اور لوگوں کی لوٹ مار سے مٹی جارہی تھی۔ جب سے انگریزوں نے ہماری ریاست کا ایک بڑا علاقہ دبالیا ہے۔ اس وقت سے ریاست کو ساہوکار لوگ بھی قرض دیتے ڈرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ریاست میں امن وامان تو ہے نہیں پھر کس بھروسے پر قرضہ دیا جائے۔

رانی:۔ گنگا بائی! تمہیں خوب معلوم ہے کہ سورگیہ مہاراجہ کی طویل علالت کے زمانہ میں مجھے کس قدر امید تھی کہ جلد یا بدیر میں نائب السلطنت بنادی جاؤں گی۔ اور اگر وزیروں نے یہ کہہ کر میری امیدوں کو خاک میں نہ ملایا ہوتا کہ مہاراجہ خود کام کرنے کے قابل ہیں۔ تو میں کبھی کی اپنے شوہر کی جانشین ہوجاتی۔ اور اب کہ مہاراجہ سورگ کو سدھار گئے ہیں اور ہم نے انند راؤ کو متبنیٰ کرلیا ہے۔ تو یہ مکار وزیر کہتے ہیں کہ جب تک انند راؤ کی متبنیت کو گورنر جنرل تسلیم نہ کرلے اس وقت تک ریاست میں کسی جدید انتظام کا اعلان نہیں کیا جاسکتا۔ (بیٹھ جاتی ہے اور زیادہ جوش سے بولتی ہے) ان مردودوں کی حماقت اور خود غرضیوں نے مجھے پاگل بنادیا ہے۔ جی میں آتا ہے کہ ان جھوٹے مکاروں کی زبانیں گدی سے نکال لوں۔ کیونکہ وہ اب بھی یہی کہے جاتے ہیں کہ انند راؤ کو متبنیٰ اور مجھے نائب السلطنت نہ بنانے سے وہ راج کی خدمت کررہے ہیں۔ مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ انہوں نے انگریزوں سے سازباز کرلی ہے تاکہ انگریز جھانسی راج کا الحاق کرلیں۔ اور یہ لوگ مزے کریں۔

گنگا بائی:۔ صبر کرو۔ میری بہن صبر کرو۔ مانا کہ انگریز غاصب، ملک گیر اور بے اصولے ہیں۔ لیکن وہ بیوقوف نہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ بندیلکھنڈ کے رجواڑے بھروسہ کے قابل نہیں۔ اور ان کے درمیان جھانسی کی ایک وفادار مرہٹہ ریاست کا وجود خاص قدر وقیمت رکھتا ہے۔

رانی:۔ (اٹھ کر ٹہلنے لگتی ہے) لیکن اس بات کا اطمینان بھی تو ہوجائے۔ کوئی اور گورنر جنرل ہوتا تو فکر کی بات نہ تھی۔ لیکن اس گورنر جنرل (ڈلہوزی) کا منہ ایک بے پایاں خلیج کی طرح کھلا ہوا ہے۔ ستارہ کی قدیم ترین مرہٹہ ریاست کو تو وہ نگل گیا۔ اور اب سننے میں آرہا ہے کہ وہ ناگپور کے بھونسلا خاندان کی مرہٹہ ریاست کو بھی کھاجانے والا ہے۔ اور بہانہ یہی ہے کہ آخری مہاراجہ نے کوئی وارث تخت وتاج نہیں چھوڑا۔ اور پھر پنجاب کو دیکھو۔ سکیم کی ریاست کو دیکھو۔ برہما کو دیکھو۔ یہ خونخوار انگریزی دیوان سب کو کس طرح ڈکار لئے بغیر ہضم کرگیا ہے۔ مجھے تو جھانسی کی طرف سے بھی ڈر معلوم ہوتا ہے۔

گنگا بائی:۔ اس میں شک نہیں۔ یہ انگریز بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ اور ہمیشہ اپنی فیاضیوں کی نمائش کرتے رہتے ہیں

اس لئے میرے خیال میں وہ جھانسی راج کو آزاد و خود مختار رکھنا زیادہ پسند کرینگے۔ تاکہ ہمارے اوپر یہ احسان رہے کہ "دیکھو ہم کمزور رجواڑوں کے کتنے دوست ہیں۔ خصوصاً ان کے جو اپنی ریاستوں کا انتظام ایسا اچھا رکھتے ہیں جیسا سورگباشی مہاراجہ جھانسی نے اپنے عہد کے آخری زمانہ میں رکھا تھا۔ اور اسی بناء پر وہ آنند راؤ کی ابتنیت کو تسلیم کریں گے۔ اس معاملہ میں آپ زیادہ تشویش نہ کریں۔ نتیجہ اچھا ہی نکلے گا۔ اور دشمنوں کے کان بہرے۔ اگر خلاف ہوا تو ہرچہ بادا باد گنگا بائی آپ کے قدموں سے کبھی علیحدہ نہیں ہو سکتی۔ (جھک کر پالاگن کرتی ہے)

رانی:۔ (گنگا بائی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے)۔ بہن ہم دونوں ایک ہی شوہر سے لطف صحبت اٹھا چکے ہیں۔ اور خوب جان گئے ہیں۔ جیسا کہ جلد یا بدیر تمام عورتوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ عورتیں مردوں کے نزدیک صرف کھلونا ہوتی ہیں اس لئے آئندہ سر پر بری پڑے یا بھلی۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کا ساتھ دینا چاہئے۔ اور جس طرح دیوی شریمتی اہلیا بائی نے اپنی تمام زندگی ریاست اندور کی خدمت اور سلامتی کے لئے وقف کر دی تھی۔ اسی طرح ہم کو بھی اپنی تمام قوتیں اور اپنی تمام دعائیں اپنی اس (چاروں طرف ہاتھ سے اشارہ کرکے) چھوٹی سی محبوب ریاست جھانسی کی سلامتی اور خوشحالی کے لئے صرف کر دینا چاہئے۔ ان زمینوں۔ ان عمارتوں۔ ان درختوں۔ اور ان پانیوں پر ہاتھ پاؤں مارے بغیر انگریزوں کو کیوں قبضہ کرنے دیا جائے؟ کیا جس قدر ان چیزوں کی محبت میرے اور تمہارے دلوں میں ہے۔ اسی قدر انگریزوں کے دلوں میں بھی ہوگی؟ کیا ان کے دلوں میں بھی مرہٹہ سورماؤں کی یاد جنہوں نے یہ دلفریب اور زرخیز علاقہ مغلوں اور راجپوتوں سے چھینا تھا۔ اسی طرح قائم رہ سکتی ہے جیسے ہمارے دلوں میں؟ کیا رعایا کی ضرورتوں، ان کی امیدوں اور ان کے خطروں کو بھی وہ اسی طرح محسوس کرینگے جیسے کہ ہم۔ جنہوں نے سو برس سے زیادہ عرصہ سے بندیلکھنڈ کو اپنا وطن بنا رکھا ہے؟ میرے پتا اور وزیروں سے زیادہ ان سوالوں کا جواب اور کوئی نہیں جان سکتا۔ بایں ہمہ وہ باتیں بنا بنا کر معاملہ کو کھٹائی میں ڈال رہے ہیں۔ اور راج کو بچانے کے لئے کچھ نہیں کرتے۔ (سخت جوش میں) گنگا بائی! میرا دل بار بار کہہ رہا ہے کہ اگر میں خود اٹھ کر کوئی کام نہ کروں گی تو جھانسی راج ہاتھوں سے نکل جائیگا۔

> اس وقت "ہوا ہوا" کی آواز سنائی دیتی ہے اور فوراً داھنی طرف سے آنند راؤ ڈھال تلوار سے مسلح اور اس کے پیچھے راؤ آپا لکڑی کی تلوار لئے ہوئے آتے ہیں۔ دونوں رانی کے سامنے شمشیر زنی کرتے ہیں۔ راؤ آپا دبتا جاتا ہے اور بالآخر ایک جگہ گویا ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے۔ آنند راؤ فتحمندانہ حیثیت سے راؤ آپا کے سینہ پر پاؤں رکھ کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر "آنند کمار کی جے" کا نعرہ لگاتا ہے۔ رانی اور گنگا بائی بھی خوش ہو کر تالیاں بجاتی اور "آنند کمار کی جے" کے نعرے لگاتی ہیں۔

رانی:۔ (فرط مسرت سے) واہ بیٹا واہ! شاباش!! میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی کہ تم اس قدر محنت سے تلوار چلانا سیکھ رہے ہو۔ ہر مرہٹہ سردار کا فرض ہے کہ وہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہے۔ اچھا اب میرے پاس آؤ۔ میں تمہیں مہاراجی کی بچی پر تیغا سکھا دوں۔ (آنند راؤ رانی کے پاس آتا ہے) بائیں ہاتھ میں تلوار پکڑ کر سیدھا سامنے کی طرف پھیلاؤ۔ اور اپنا داھنا ہاتھ

سینہ پر رکھو۔ دیکھو اس طرح (ہاتھ رکھ کر دکھاتی ہے) اور اب یہ الفاظ یہ دُہراؤ:۔

"تلوار دھنی پتا کھنڈوبا اور تمہاری جی پر میرا ایمان ہے۔ یہ دونوں شیوجی کے روپ ہیں۔ جو شر کا مٹانے والا۔ شفا بخشنے والا اور زندگی کو پاک کرنیوالا ہے۔ میں ہمیشہ شیواجی اور شمبھاجی اور بڑے بڑے پیشواؤں کے نقشِ قدم پر چلونگا۔ جو غریبوں کی دستگیری کرتے تھے۔ بھوکوں کو کھانا کھلاتے تھے اور مغروروں کا سر توڑتے تھے۔ میں ایک سچا مرہٹہ بننے کا حلف اٹھاتا ہوں۔ ظالموں سے لڑونگا۔ ستمگاروں کو سزا دونگا۔ اور دھرم کی پرکھشا کروں گا۔ میں عاجزوں اور بیکسوں کی فریاد سنونگا۔ اور میرا دروازہ ان لوگوں کے لئے کبھی بند نہ ہوگا جو متقی اور پرہیزگار ہیں اور دھرم کے مقدس طریقہ پر آزادی کے طلبگار۔"

{ انند راؤ رانی کے الفاظ دُہراتا ہے۔ عین اس وقت داہنی طرف سے ماما صاحب، نرسنگھ۔ لالہ لاہوری مل اور لالہ ٹیٹی چند داخل ہوتے ہیں۔ انند راؤ کی پرتگیا سنتے ہیں اور پھر رانی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ }

ماما صاحب:۔ بیٹی! میجر ایلیس جو سرکار انگریزی کی طرف سے بندھیلکھنڈ میں پولٹیکل ایجنٹ ہیں۔ گھنٹہ بھر ہوا کہ یہاں آئے ہیں۔ وہ ہمارے فوجی افسروں کے ساتھ فوجی استحکامات اور قلعبندیوں کا معائنہ کر رہے ہیں۔ اور ہم ابھی ان کے پاس سے آرہے ہیں۔ جیل کے قیدیوں نے پھر گڑبڑ مچائی ہے۔ ایسا نہ ہو بغاوت کر بیٹھیں۔ اس لئے احتیاطی تدابیر کی سخت ضرورت ہے۔

رانی:۔ میں بار بار دریافت کر چکی ہوں کہ آخر جیل میں آجکل اتنے آدمی کیوں ٹھونس دیئے گئے ہیں۔ مگر کوئی شخص قابل اطمینان جواب نہیں دیتا۔

لاہوری مل:۔ مہارانی! پرماتما کی کرپا سے آپ کے راج میں ہر طرف خوشحالی اور فارغ البالی نظر آتی ہے۔ اس لئے چاروں طرف کے بدمعاش یہاں جمع ہوگئے ہیں۔ جہاں کھانے کو ملتا ہے وہیں بھوکے کتّے جمع ہو جاتے ہیں۔

گنگا بائی:۔ (دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر غضبناک انداز سے) تو لالہ جی! یہ قصور کس کا ہے کہ کتّے بھوکے ہیں؟ کیا ہمارا قصور نہیں۔ نہ ہم بدنظمی کے مرتکب ہوتے نہ لوگ فاقوں سے مجبور ہو کر چوری اور ڈکیتی پر آمادہ ہوتے۔

نرسنگھ:۔ گنگا بائی! انصاف کرو۔ ہم لوگ تو انتظام کرنے والے کے آلۂ کار ہیں۔ راجہ حکم دیتا ہے اور ہم اسکو بجالاتے ہیں۔ اگر حوصلہ ہے تو فرمانروا کو الزام دو۔ ہمارا اس میں کیا قصور ہے۔

رانی:۔ (اول آہستہ آہستہ اور پھر لہجہ تند اور جوشیلا ہو جاتا ہے) گنگا بائی جو کچھ کہتی ہے وہ بالکل سچ کہتی ہے۔ جھانسی راج کا انتظام انگریزوں کے ہاتھ میں جانے سے پہلے ریاست کی آمدنی روز بروز گھٹتی جاتی تھی۔ اور ریاست کا بال بال قرض میں بندھ گیا تھا۔ لیکن اس وقت ہمارے کسان ہم سے محبت کرتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر اُن کی فصلیں خراب ہوگئیں یا ان کے گھر جلا دیئے گئے تو راجہ ان کی مالگذاری معاف کر دیگا۔ اور دوسرے طریقوں سے بھی ان کی مدد کریگا۔ مگر اب انگریزوں نے زمینداروں کو نمبردار بنا کر راجہ اور پرجا کے درمیان ایک طبقہ کھڑا کر دیا ہے۔ جو کسانوں سے لگان وصول کر کے خزانہ میں داخل کر دیتے ہیں۔ اس طرح

راجہ اور پرجا کا براہ راست تعلق جاتا رہا ہے - اور اس سے بھی بدتر یہ بات ہے کہ لگان ایک مدت دراز کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے اور اس میں بھی تشخیص لگان بسا اوقات غیر منصفانہ ہوئی ہے - اب خواہ قحط پڑے یا خشک سالی ہو - مویشی مر جائیں یا مال چوری ہو جائے - مگر بیچارے کاشتکاروں کو قرض لینا پڑتا ہے - نہ صرف اس لئے کہ اپنے نقصانات کی تلافی کریں - بلکہ اس لئے بھی کہ جابرانہ لگان ادا کر کے زمیندار کی جیب اور ریاست کا خزانہ بھریں - پھر دیوان جی! آپ ہی بتائیں کہ جیلخانہ بھرپور نہ ہو تو کیا ہو؟ آجتک وہ بات کبھی سننے میں نہ آئی تھی جو آپ اب کھُلے خزانہ کہہ رہے ہیں - یعنی جھانسی تو ڈاکوؤں اور ساہوکاروں کی جنت ہے - (دفعتاً مندر کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے اور ہاتھ اٹھا کر کہتی ہے) اے ہماری قوم کے دیوتاؤ! اور دیویو! گواہ رہنا کہ نائب السلطنت بننے ہی میرا سب سے پہلا کام ان آلام و مصائب کا علاج کرنا ہوگا - جن میں آجکل ہماری غریب رعایا گرفتار ہے -

(چند لمحہ سکوت طاری ہو جاتا ہے - جیسے رانی کے باپ کی کھنکار اور آواز توڑتی ہے)

ماما صاحب:- بیٹی ہم تم سے یہ کہنے آئے تھے کہ میجر ایلیس کے نزدیک گورنر جنرل کی طرف سے انند کمار کی متبنیت تسلیم کر لیا جانا یقینی نہیں ہے - میجر صاحب نے ہم سے بیان کیا ہے کہ ان کے افسر بالا دست میجر مالکم نے ان کو بذریعہ خط تنبیہ کر دی ہے - کہ متبنیت کے معاملہ میں سرکار انگریزی کی طرف سے ہرگز کوئی وعدہ نہ کرنا - اس معاملہ کا فیصلہ برہما سے آکر خود لارڈ ڈلہوزی کریں گے -

نرسنگھ:- اور حضور اس قدر عرض تو میں بھی باادب کر سکتا ہوں کہ میجر ایلیس جھانسی راج کے ہمیشہ دوست اور خیر خواہ رہے ہیں - اور اب سے دس برس گذرے کہ انہی کی کوششوں کی بدولت جھانسی راج کا نظم و نسق ہم لوگوں کے ہاتھ میں آیا تھا - پھر جب ایسا شخص ریاست کے متعلق کھٹکا رکھتا ہے تو معاملہ واقعی تشویش انگیز ہے - میجر صاحب فرماتے ہیں کہ کرنل لو اور گورنر جنرل کی کونسل کے دیگر ممبروں کا گورنر جنرل کی عدم موجودگی میں انند کمار کا حق تسلیم کرنے سے انکار کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ جو شخص ستارہ - پنجاب - سکیم - برہما اور بہت سے دیگر علاقوں کو ہضم کر چکا ہے وہ غالباً جھانسی کو بھی نہیں چھوڑے گا - الغرض مجھے تو جھانسی کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے -

رانی:- اور آپ لوگوں نے میجر صاحب سے کیا کہا؟

ماما صاحب:- بیٹی ہم لوگ کیا کہہ سکتے تھے - خالی خولی دھمکیاں بیکار ہیں - ہم سے بس یہی ہو سکتا ہے کہ عرضیاں گذرانتے جائیں - اور بھلائی کی امیدیں رکھیں -

نرسنگھ:- مہارانی! ہم نے میجر صاحب سے التجا کی ہے کہ وہ جھانسی راج کو بچانے کے لئے حتی المقدور کوشش کریں - اور باتوں باتوں میں کنایتہً یہ بھی سمجھا دیا ہے کہ جو لوگ اس آڑے وقت میں ریاست کے کام آئیں گے شاہی خاندان ان کی خدمات کا ضرور خیال رکھیگا - میجر ایلیس نے بھی ازراہ عنایت فرمایا کہ دو تین روز میں وہ اس معاملہ کے متعلق میجر مالکم سے پھر ملاقات کریں گے - لیکن وہ کسی قسم کا وعدہ نہیں کر سکتے - مگر ان کا خیال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں لارڈ ڈلہوزی پر مقامی افسران

کے کہنے سننے کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ (اطمینان سے ہاتھ ملکر) بہرحال اگر بُرا وقت آہی گیا تو انہوں نے وعدہ کرلیا ہے کہ وہ اس بارہ میں ضرور کوشش کریں گے کہ آپ کو اور آنند کمار اور دیگر متعلقین اور متوسلین کو گذارہ کے لئے ایک معقول پنشن دیجائے۔

رانی :۔ کیا میرے پتاجی اور میرے بہادر افسر اتنا ہی کرسکتے ہیں؟ کیا خوشامدیں کرنے اور ناک رگڑنے کے بعد وہ اسی نتیجہ پر قناعت کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ (آواز کسی قدر بلند کرکے) سنئے! اور کان لگاکر سنئے! کہ آج سے میں اور صرف میں انگریزوں کیساتھ جھانسی راج کی ترجمانی کروں گی۔ کیونکہ میں ہی وہ ہوں جسے سورگیہ مہاراج نے نائب السلطنت اور ولیعہد آنند راؤ کا سرپرست نامزد کیا تھا۔ آپ لوگوں کی غلامانہ پالیسی سے میں بھر پائی۔ نہ اس سے کبھی پہلے کام چلا تھا۔ نہ اَب چلے گا۔ انگریز تم لوگوں کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور تم خود اس بات کو خوب جانتے ہو۔ اب تم مجھ عورت ذات کو کام کرنیکا موقعہ دو۔ کہتے ہیں کہ انگلستان میں ایک بہت بڑی ملکہ راج کرتی ہے۔ اور تمام مرد اسکی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس خاص وجہ سے بھی وہ مجھ سے کوئی تعارض نہ کریں۔ میں آپ لوگوں کو جتائے دیتی ہوں کہ آئندہ سے مجھے ایک عاجز اور بے دست و پا ہندو بیوہ نہ سمجھا جائے۔ بلکہ نام اور کام دونوں لحاظ سے جھانسی کی رانی سمجھا جائے۔ دیوان صاحب! فوراً منادی کرادیجئے کہ لوگ شام کیوقت قصر شاہی کے صحن میں دیوانخانہ کے سامنے جمع ہوں۔ تاکہ آنند کمار کے بارہ میں اعلان کردیا جائے۔ اگر انگریزوں نے اس کی متبنیت کو تسلیم نہ کیا تو ان سے نہ صرف جھانسی کی رعایا بلکہ تمام ہندوستان نفرت کرنے لگیگا۔ او پتاجی! آپ میجر ایلیس کو ساتھ لیکر قصر شاہی میں تشریف لائیں۔ ہم اُن سے اپنے ارادوں کا اظہار کرینگے۔ اگر جھانسی کو ہمارے ہاتھ سے نکلنا ہی ہے تو پھر کیوں نہ بہادر مرہٹوں کی طرح جان پر کھیل کر دیا جائے؟ لالہ جی! تمام پہلوانوں، شمشیر بازوں اور بازیگروں کو بھی محل میں جمع ہونیکا حکم دیدیجئے۔ دُنیا کو دکھادینا چاہیئے کہ جھانسی والے اَب بھی مرنا خوب جانتے ہیں۔ راؤ آپا! درختوں کے پیچھے ہماری پالکی کھڑی ہے اسے طلب کرو۔ اور تم سب لوگ یہ بات کان دھر کر سن لو کہ جو حکم میں دونگی۔ اُسے ماننا پڑے گا۔ کسی چھوٹے بڑے کی تفریق نہ ہوگی۔ اگر کسی شخص نے میرے حکم کی تعمیل میں قصور کیا یا مجھے راج کا مالک نہ سمجھا تو وہ سزا پائے گا۔؟

ایک بڑی شاندار اور آراستہ پالکی آتی ہے۔ سوار ہونے سے قبل رانی ہاتھ اٹھا کر "کمار آنند راؤ کی جے" کا نعرہ لگاتی ہے۔ جس میں سب حاضرین شریک ہوجاتے ہیں۔ گنگا بائی پالکی کے ساتھ ساتھ بائیں طرف ہولیتی ہے۔ ماما صاحب اور وزراء سلام کرتے ہیں۔ رانی کے بعد ماما صاحب آنند راؤ کو پکڑکے چاروں طرف گھماتا ہے اور اسے اپنے کاندھے پر بٹھا لیتا ہے۔ لڑکے کا منہ وزیروں کی طرف ہوتا ہے۔ اس کے بعد ماما صاحب "جھانسی راج کی جے" کا نعرہ لگاتا ہے۔ سب وزرا بھی دو تین مرتبہ یہی نعرہ لگاتے ہیں۔

(باقی)

مسئلۂ خلافت و امامت

"نگار" مارچ ۳۵ء کی اشاعت میں "خلافت و امامت" کے عنوان سے ایک مقالہ شایع ہوا ہے جس کو کسی ہندو اہلِ قلم جناب "ہرنام" کی کاوشِ دماغی کا نتیجہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس طرح سے دیکھنے والے پر بظاہر یہ اثر پڑتا ہے کہ ایک بے تعلق غیر مسلم کے خیالات ہونے کی بنا پر بحث میں غیر جانبداری کیساتھ خالص تحقیقی نقطۂ نگاہ کو پیش نظر رکھا گیا ہوگا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ محترم موصوف باوجود ہندو ہونے کے "شیعیت" کیساتھ جذباتی ہمدردی رکھتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے گو بظاہر اُن کا اسم گرامی "ہرنام" ہے۔ لیکن شاید وہ اپنے اس مضمون میں اس حقیقت کو چھپانے میں کامیاب ہو سکے کہ دل کی گہرائیوں سے وہ حضرت علی کی امامت کو ایک مذہبی کے تمام جذباتی رنگ کیساتھ تسلیم کر چکے ہیں۔ تحریر کا رنگ قدم قدم پر اُن کی اس شکست پر غمازی کرتا ہے۔ بالخصوص جہاں اُن کا "دل تھراتا ہے۔ قلم لرزتا ہے۔ جی چاہتا ہے مورخوں کے منہ پر ہاتھ رکھدیں، کس طرح دیکھیں اور کیونکر لکھیں کہ کس کس نے فرار کیا۔" (صفحہ ۴۴)

بہرحال جو کچھ بھی ہو اُن کی تحقیقی کاوش کی داد نہ دینا بڑی بے انصافی ہوگی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس مبحث پر قلم اُٹھاتے وقت موصوف نے واقعات پر "فلسفۂ تاریخ" کی روشنی میں نفسیاتی اعتبار سے کوئی نظر نہیں ڈالی۔ نیز "فلسفۂ نبوت" اور عام اخلاقِ انسانی کے فلسفہ کے پہلو سے بھی اس سوال پر تفصیلی غور نہیں فرمایا۔ ممکن ہے کہ میری یہ حقیر کوشش کسی حد تک حقیقت کے چہرہ کو بے نقاب کرنے میں مدد دے۔

افسوس ہے کہ میں یہاں تفصیل کیساتھ مقالہ نگار کے استدلال کے ہر ہر جزو پر نظر نہیں ڈال سکتا۔ میں جو کچھ کروں گا وہ ایک ایسے مورخ کے اجمالی تبصرہ کے مترادف ہوگا جو واقعات کو منطقی علل و استنتاج کے ساتھ ساتھ دنیا کے عملی فلسفہ کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ بہرحال میں مسلمان ہوں اور پھر اہل سنت۔ اس لئے میں حتی الوسع کوشش ضرور کروں گا کہ اپنی تحریر میں جذباتی رنگ نہ آنے دوں۔ لیکن پھر بھی کسی بے راہ روی کا پہلے سے معذرت خواہ ہوں۔

بزمی

فلسفہ کے تمام عمیق مسائل طے ہو سکتے ہیں۔ ریاضی کے دقیق سے دقیق نظریے حل کئے جا سکتے ہیں۔ نظام بطلیموسی

کی جگہ نظام فیثاغورث لے سکتا ہے۔ نیوٹن کے نظریہ کشش کو انیشٹن بدل کر رکھ سکتا ہے لیکن اگر بلند نظری اور بے لوث تحقیقی نگاہ سے ایک لمحہ کے لئے بھی اعراض کر لیا جائے تو نہ یہ مسایل طے ہو سکتے ہیں اور نہ مسلمانوں میں ساڑھے تیرہ سو برس گذر جانے کے باوجود خلافت و امامت کا مسئلہ سلجھ سکتا ہے۔

اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ نبی کریم کی سب سے بڑی حیثیت ایک اخلاقی مودب کی حیثیت ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں لئے جا سکتے کہ آپ کی اس حیثیت سے "سیاست ملکی" خارج ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ دنیا میں عام طور پر اخلاقی درس دینے والے مصلحین کی زندگی میں سیاست بہت کم داخل ہوتی ہے۔ لیکن رسول عربی کا مسئلہ ان سب سے جدا ہے آپ کی تعلیم کا کوئی جزو اُس وقت تک حقیقی معنی میں مکمل نہیں ہو سکتا جب تک حکومت و سیاست کی اعانت اس کیساتھ شامل ہو۔

پھر یہ کوئی ایسی حقیقت نہیں ہے جس کو اہل سنت مسلمان تعصب کی بنا پر کہتے ہوں۔ بلکہ یوروپ کے بے تعلق مستشرقین بھی متفقہ طور پر اس رائے کی تائید کرتے ہیں۔ اگر گولڈزیہر۔ فان کریمر۔ نولڈکی۔ دی ساسی۔ کاتزمیر۔ نکلسن اور براؤن جیسے مسلّمہ فاضل مصنفین کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے تو قدم قدم پر اس حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ ــــــ محمدؐ کی تعلیمات میں "چرچ" اور "اسٹیٹ" دو جدا جدا چیزیں نہیں ہیں۔

غور کیجئے کہ اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ مان لیا جائے کہ نبی اکرم سیاست سے بالکل علیحدہ رہ کر اخلاقی تعلیم دینا چاہتے تھے تو پھر قرآن و حدیث کی اُن سینکڑوں ہدایات کی کیا تاویل کی جائے گی جن میں خالص سیاسی مسایل بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً جزیہ۔ ذمی۔ حربی۔ جہاد۔ حد زنا و سرقہ وغیرہ وغیرہ۔

اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا۔ (سورہ المائدہ۔ آیۃ ۳)

کی آیت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی۔ اگر نبی کریم کے معاشرتی اور اخلاقی اصلاح کے پروگرام میں حکومت و سیاست داخل نہ ہوتی تو اس آیت میں "الیوم" کا مفہوم ہی کچھ باقی نہ رہتا۔ اس لئے کہ اگر فتح مکہ کے بعد سے نبی کریم کی سیاسی حیثیت کا مسلّم ہو جانا آپکے "درس" کی تکمیل میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تو پھر "الیوم" کا لفظ بھی کچھ زیادہ بامعنی نہیں رہتا۔

پھر اخلاقی اور معاشرتی اصلاح (سوشل ریفارم) کو سیاست کے ساتھ ساتھ رکھنے کا نظریہ کوئی ایسا نظریہ نہیں ہے جس کو عقل باور نہ کر سکے۔ دُنیا کا بڑے سے بڑا مصلح اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ معاشرتی اصلاح اسوقت تک ناممکن ہے۔ جب تک ملکی سیاست کے ارباب حل و عقد اس میں دستگیر و معاون نہ ہوں۔ گاندھی ہندوستان کا بلند ترین سیاسی رہبر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن وہ ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ اس حقیقت کو تقریروں اور تحریروں میں آشکارا کر چکا ہے کہ "میرا حقیقی مشن معاشرتی اصلاح ہے۔ لیکن وہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں نہ ہو۔"

حقیقتاً وہ لوگ اسلام کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے جو یہ کہتے ہیں کہ اسکو سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام صرف

ریاضت کرنے یا گوشہ میں بیٹھ کر عبادت کرنیکا ایک نظام نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف وہ ایک ایسا عملی پروگرام ہے۔ جو انسان کو زندگی کے ہر شعبہ میں صحیح مسلک پر کاربند رکھنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کا صحیح حصول اسوقت تک نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ ملکی نظام پر صحیح معنی میں پورا پورا اختیار نہ ہو۔

پھر اگر یہ باور بھی کر لیا جائے کہ نبی کریم کا مقصد سیاست سے بالکل علیحدہ تھا اور یہ بعد کی بدعت ہے تو پھر وہ جماعت جو حضرت علی کو نبی کریم کا صحیح جانشین قرار دیتی ہے۔ اسکا کیا جواب دیگی کہ خود حضرت علی نے بھی مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد اس کے خلاف آواز بلند نہیں کی۔ بلکہ اس کے علی الرغم اپنی سیاسی اہمیت کے قیام و بقاء کے لئے جنگ جمل میں صف آرائی کی۔ طلحہ و زبیر کو قتل کرایا۔ معاویہ کے مقابلہ کے لئے میدان صفین میں پڑاؤ ڈالا۔ اور پھر نہروان میں تقریباً تین ہزار[1] کلمہ گو اہل عرب کو تہ تیغ کرایا۔ میں پوچھتا ہوں کہ ان تمام مقتولین کے خلاف اگر "بغاوت" کا الزام نہ تھا جو خالص سیاسی الزام ہے تو پھر حضرت علی کی پوزیشن جس درجہ نازک ہو جاتی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اگر ان کی حیثیت ایک معمولی "پیر" سے زیادہ نہ تھی تو آجکل کے مجتہد کی طرح انہوں نے ان مواقع پر صرف خاموشی کا اظہار کیوں نہ کیا؟ یا زیادہ سے زیادہ اُن سے اپنی برأت کا اعلان کر کے خاموش کیوں نہ ہو گئے؟

بہر حال خلافت و امامت کے مسئلہ میں اگر بے تعصبی کیساتھ ذرا سے غور سے بھی کام لیا جائے تو یہ حقیقت بے نقاب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ نبی کریم کا صحیح جانشین وہی ہو سکتا ہے جو ایک طرف تو اخلاقی فضیلت میں دنیا کا مکمل ترین انسان ہو اور دوسری طرف سیاسی حل و عقد میں دنیا کا مہذب ترین فرمانروا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں حیثیتوں کے اعتبار سے صحابۂ کرام کے گروہ میں سے نبی کریم کا صحیح جانشین کون ہو سکتا تھا اگرچہ دنیا کا عام اصول تو یہ ہے کہ جو شخص کسی عہدہ کو بغیر کسی قباحت کے انجام دے۔ اسے اس عہدہ کا اہل سمجھا جاتا ہے۔ اور اس لئے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی اہلیت میں تو کوئی شک ہونا ہی نہ چاہئے۔ جبکہ دنیا کا ہر بلند نظر مورخ ان حضرات کی اخلاقی پاکیزگی سیاسی بلند نظری۔ اور عام معاشرتی رفعت و برتری کا بھی قایل ہے۔

لیکن یہاں پہنچکر ہم کو جس پُرخار وادی میں داخل ہونا پڑتا ہے وہ یہ ہے۔ "کیا نبی کریم حضرت علی کو اپنے بعد اپنا خلیفہ بنانا چاہتے تھے"؟

حضرت علی ایک متقی، زاہد اور فداکار صحابی ہونے کے علاوہ آپ کے چچیرے بھائی تھے۔ ابتدا سے آپکے رفیق و معاون رہے۔ بعد میں داماد بھی ہو چکے تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ نبی کریم نے مختلف اوقات میں مختلف حالات سے متاثر ہو کر آپ کے

---

[1] - ملاحظہ ہو۔ الکامل المبرد مطبوعہ مصر جلد سوم صفحہ ۱۰۵ - فان کریمر وغیرہ مستشرقین یورپ نے اس کتاب کو حضرت علی کی خلافت کے واقعات میں نہایت ہی مستند مرتبہ دیا ہے۔

اوصاف بیان فرمائے ہیں۔ لیکن اگر ان اوصافی الفاظ کی منطقی اور لغوی تحلیل کرکے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ نبی کریم آپ کو اپنا جانشین بنانیکے خواہشمند تھے۔ تو منصب نبوت کو سمجھنے میں اس سے بڑھ کر اور کوئی بنیادی غلطی نہیں ہو سکتی۔ غور تو کیجئے کہ جس شخص کو محمد عربی کے الہامی نبی ہونے پر ایمان ہو وہ یہ سوال کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر فی الواقع آپ الہامی طور پر حضرت علی کو اپنا خلیفہ بنانے پر مامور ہو چکے تھے تو پھر آپ نے علی رؤس الاشہاد اس کا اعلان کیوں نہ فرما دیا؟ جو بے خوف اور نڈر پیغمبر اپنے عزم و ثبات کے مقابلہ میں ساری دنیا کو چیلنج دے سکتا ہے۔ ان کے بت خانوں کو چکنا چور کر سکتا ہے۔ شراب کے قرابوں کو توڑ واکر پھنکوا سکتا ہے۔ اہل عرب کے نسبی فخر کو پاؤں کے نیچے کچل سکتا ہے۔ کیا اس کی اس اخلاقی کمزوری کا کسی حیثیت سے بھی اعتراف کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ محض چند لوگوں کے ڈر سے اپنے جانشین کا اعلان کرتے ہوئے ڈرتا رہے؟ ہر وہ شخص جس کو الہام اور وحی پر ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی طرح عقیدہ ہو وہ یہ باور نہیں کر سکتا کہ دنیا دارانہ مصلحتوں کے ماتحت ایک عظیم المرتبت نبی اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک "خلافت" جیسی عظیم حقیقت کے اظہار سے جان چراتا رہے؟

علاوہ ازیں اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ نبی کریم قدم قدم پر اشارۃً اور بالواسطہ طور پر حضرت علی کو اپنا قائم مقام بنانیکی رہبری کرتے رہے تو اس سے رسول کی پوزیشن جس درجہ نازک ہو جاتی ہے وہ زیادہ توضیح کی محتاج نہیں ہے۔

اگر ابو بکر و عمر بلا کسی دنیوی نفع کے اور بلا کسی رشتۂ قرابت و عزیزداری کے صرف اس لئے رسول پر جان دیتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ایک سچا راہنما ہے۔ اور اپنی اس صداقت کے ثبوت میں اپنی حیات کے آخری سکون تک عشق رسول کا دم بھرتے رہتے ہیں۔ اپنی نوجوان لخت جگر صاحبزادیوں کو اس کے حبالۂ ازدواج میں دیدیتے ہیں۔ اس کے ایک ایک اشارہ پر کٹھ پتلیوں کی طرح ناچتے ہیں۔ اس کے حکم کے سامنے اپنی ساری دھن دولت لٹا دیتے ہیں ——— غرضکہ وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ایک جانفروش کو کرنا چاہئے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اگر وہ رسول کی بارگاہ میں صرف اس لئے نظروں سے گرے ہوئے ہیں کہ ان کے مقابلہ میں رسول کا چچیرا بھائی اور اسکا داماد ہے ——— تو پھر اسکا نام "متعصبانہ اعزہ پرستی" (Favouritism) نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اگر اس کو بدترین قسم کی "بیرحمانہ جانبداری" اور "غیر منصفانہ پاسداری" نہیں کہہ سکتے تو اور کیا کہیں گے؟

لیکن تاریخ اسلامی کا ہر اسٹوڈنٹ جانتا ہے کہ نبی کریم کی ذات گرامی اس قسم کی تنگ نظریوں سے بہت بلند ہے۔

اب ہم بحث کے اس رخ کی طرف آتے ہیں۔ جہاں یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ "حضرت علی تمام صحابہ سے زیادہ خلافت کے مستحق تھے"۔ اس حقیقت کو بے لوث تحقیقی نگاہ سے جانچنے کے لئے ایک بہترین طریقہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ مستشرقین یورپ ان کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ ہم یہاں صرف نکلسن کے الفاظ کو نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ جو تقریباً تمام ذی رتبہ مستشرقین کی آراء کی طرف سے نمایندگی کر سکتے ہیں:۔

"حضرت علی میں حکمران ہونے کے علاوہ اور تمام صفات موجود تھیں"۔[۱]

---

[۱] ۔ لٹریری ہسٹری آف عرب۔ مصنفہ نکلسن صفحہ ۱۹۱ ۔

اس کے بعد ہمارے سامنے جو چیز ابوبکر و عمر کے مقابلہ میں حضرت علی کے شرف و فضیلت کا صحیح معیار پیش کر سکتی ہے وہ ان دونوں کے عہدِ خلافت کا مقابلہ ہے۔

خلفاء کی زندگی کا یہ پہلو اگرچہ ہماری بحث کا فیصلہ کن جواب ہونا چاہئے تھا۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ چونکہ یہ مقابلہ بے انتہا غیر مبہم اور واضح ہے اس لئے "مویدینِ امامت" نے اس میدان میں اپنی شکست کو یقینی سمجھتے ہوئے اپنی رزمگاہ کے دو اور میدان تلاش کئے ہیں۔ یعنی ایک تو یہی کہ آیا خلافت کے مفہوم میں سیاست داخل ہے یا نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ نبی کریم کے اقوال سے حضرت علی کی بے انتہا فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ پہلے مسئلہ پر ایک اجمالی تبصرہ کیا جا چکا ہے اسلئے اب ہمارے سامنے صرف دوسرا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ خود نبی کریم کے اقوال سے حضرت عمر و ابوبکر کے مقابلہ میں حضرت علی کی کیا فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں "مویدینِ امامت" "انا مدینۃ العلم و علیٌّ بابھا" کی حدیث کو نہایت شدت کیساتھ پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے مقابلہ میں حضرت عمر کے متعلق صحیح بخاری کی ان احادیث کو ملاحظہ فرمایا جائے:۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ خواب میں میرے سامنے کچھ لوگ پیش کئے گئے جو کرتے پہنے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی کا کرتہ سینہ تک تھا۔ کسی کا اس سے نیچے۔ پھر عمر میرے سامنے لائے گئے ان کا کرتہ اتنا لمبا تھا کہ اس کا دامن زمین پر گھسٹتا جاتا تھا۔ لوگوں نے پوچھا "اس کی تعبیر"؟ آپ نے فرمایا۔ "عمر کی دینداری" [1]

اسی قسم کی ایک دوسری حدیث ہے جس میں آپ نے خواب میں ایک گلاس سے کچھ دودھ پیا۔ اور باقی حضرت عمر کو دیدیا۔ اور لوگوں کو اس کی تعبیر "علم" بتلائی۔ [2]

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اس سے پہلے بنی اسرائیل میں ایسے لوگ گذر چکے ہیں جو اگرچہ پیغمبر نہ تھے لیکن ان پر خدا کی جانب سے الہام ہوتا تھا۔ اگر میری امت میں سے کسی شخص کو یہ مرتبہ حاصل ہے تو وہ عمر ہیں۔ [3]

حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر کی وفات کے وقت حضرت علی کو یہ کہتے سنا ہے کہ "مجھے یقین تھا کہ خدا تجھ کو تیرے دونوں ساتھیوں (رسول کریم و ابوبکر صدیق) کے ساتھ رکھیگا۔ کیونکہ میں نے اکثر نبی کریم کو یہ کہتے سنا ہے:۔ "کُنتُ انا و ابوبکرٍ و عمرُ" و "فعلتُ انا و ابوبکرٍ و عمرُ" و "انطلقتُ انا و ابوبکرٍ و عمرُ" [4]

ممکن ہے کہ پہلی حدیث کو محض اس لئے زیادہ قابلِ وثوق نہ سمجھا جائے کہ وہ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے۔ لیکن دوسری حدیث کے رواۃ کو تو یقیناً اس سے بلند ہونا چاہئے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان۔ [2] صحیح بخاری، کتاب العلم۔ [3] و [4] صحیح بخاری، کتاب مفضائل اصحاب النبی۔

اس سلسلہ میں بخاری کی وہ حدیث بھی قابلِ تذکرہ ہے جس میں رسول کریم سے ایک عورت نے پوچھا ہے۔ "آپ کے بعد میں مسائل کس سے پوچھوں گی؟" آپ نے فرمایا "ابو بکر سے"۔ ؎۱

ایک موقعہ پر رسول کریم نے حضرت علی کے متعلق یہ فرمایا تھا۔ "علی دنیا اور آخرت میں میرا بھائی ہے"۔ اس سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ نبی کریم اس طرح آپ کو اپنا جانشین بنا رہے تھے۔ حضرت علی واقعتہً آپ کے بھائی تھے۔ اور اس لئے یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ کہتے "آمنہ دنیا اور آخرت میں میری ماں ہیں"۔ یا "عبد اللہ دنیا اور آخرت میں میرے باپ ہیں"۔

حضرت ابو بکر کی جان نثارانہ اور فداکارانہ جذبہ کی ایک بہت بڑی مثال ان کا وہ کارنامہ ہے جس کے متعلق قرآن میں مذکور ہے:۔

"ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا"۔

یہ آیت غیر مشتبہ طور پر حضرت ابو بکر کی منقبت کو ظاہر کرتی ہے۔ اگر کج بحثی کے ساتھ تاویل بعید کو کام میں نہ لایا جائے تو اس کے معنی میں کوئی اشکال نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "خدا بخش لائبریری پٹنہ" میں قرآن کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ جس پر گو کاتب کا نام درج نہیں ہے لیکن کسی شیعہ کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اس میں دو سورتیں زیادہ ہیں۔ جن میں سے ایک کا نام "نورین" ہے اور دوسری کا نام "ولایت"۔ نیز ۳۳ آیات بھی حسب ضرورت بڑھا دی گئی ہیں۔ ان سورتوں اور آیات کو قرآن میں بڑھا دینے کے بعد "مصنف" نے شیعیت کے تمام شتبہ مسائل کو قرآن میں داخل کر دیا ہے۔ اور اس اضافہ کے متعلق یہ خیال کیا گیا ہے کہ چونکہ قرآن کے یہ حصے اہلِ تشیع کی صحیح حمایت میں تھے اس لئے اہلِ سنت نے ان کو اصل قرآن سے نکال دیا۔ (نعوذ باللہ)۔ بہر حال اس قرآن میں مذکورہ بالا آیت کے مفہوم کو حضرت ابو بکر کی مذمت میں تبدیل کرنے کی خاطر اس طرح لکھا گیا ہے:۔

"یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ، وَیْحَكَ، لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا"۔

ڈوبتا آدمی تنکے کے سہارے کو غنیمت سمجھتا ہے۔ چنانچہ بعض اوقات حضرت علی کی امامت کو ثابت کرنے کے لیے ان کے سابق الاسلام ہونے کو پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اول تو یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ تاہم اگر مختلف متند اقوال کو یکجا جمع کرنے سے کوئی یقینی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ تو وہ صرف یہ ہے کہ آپ نوجوانوں میں سب سے پہلے مسلمان تھے۔

بہر حال اگر اس بات کو مان بھی لیا جائے کہ آپ سب سے پہلے ہی اسلام لائے۔ تب بھی یہ امر اتنی اہمیت نہیں رکھتا کہ محض اس کی وجہ سے آپ کو دیگر تمام صحابہ سے افضل قرار دیدیا جائے۔ اس لئے کہ گو اس میں اختلاف ہے کہ اسلام لانے کے وقت آپکی عمر کیا تھی۔ لیکن جس روایت میں سب سے زیادہ عمر بتلائی گئی ہے وہ ۱۶ برس ہے۔ اگر اسی روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے

؎۱۔ صحیح بخاری۔ کتاب فضائل اصحاب النبی۔

تب بھی یہ عمر وہ ہے جب انسان میں عقل وشعور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس عمر میں انسانی دماغ غیر پختہ ہوتا ہے۔ اور بہت جلد نئی باتوں پر یقین کر لیتا ہے۔ اور اس لئے اگرچہ حضرت علی کی مذہبی رفعت شان اور جلالت و مرتبت میں کسی مسلمان کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن مقابلتہً اُن کے اسلام کو حضرت ابوبکر و حضرت عمر جیسے پختہ کار شرفائے قریش کے اسلام کے مقابلہ میں زیادہ قابلِ اہمیت بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس کے علاوہ دوسرا سبب جس کی بناء پر ان کی یہ سابقت فی الاسلام مقابلتہً اتنی اہم نہیں رہتی جتنی بیان کی جاتی ہے۔ یہ ہے کہ وہ رسول کریم کے چچیرے بھائی تھے۔ اور اس لئے ظاہر ہے کہ ان کی اس "سابقت ایمانی" میں قریبی عزیز ہونے کی وجہ سے "وصول الی الحق" کا وہ سعادتی جذبہ کارفرما نہیں ہو سکتا جو ابوبکر و عمر جیسے غیر متعلق اشخاص میں پایا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں رسول کے بھائی ہونے کیوجہ سے قدرتی طور پر رسول کا پیغام سب سے پہلے آپ کے کانوں تک پہنچا ہوگا۔ پھر اس کو حسنِ اتفاق کی مثال کہیں تو کہہ سکتے ہیں لیکن اس میں فخر کی کوئی بات نہیں۔ فخر البتہ یہ ہے کہ رسول کا پیغام سنتے ہی فوراً "آمنّا" کہدیا جائے۔ حقیقتاً حضرت علی کو یہ فخر پہنچتا ہے۔ لیکن اس میں حضرت ابوبکر بھی برابر کے شریک ہیں۔

ابتدائے اسلام میں ایک مرتبہ نبی کریم نے اپنے اعزا کے سامنے اسلام کو پیش کرتے ہوئے حضرت علی کے متعلق کہا تھا۔

"اِنَّ ھٰذَا اَخِیْ وَ وَصِیِّیْ وَ خَلِیْفَتِیْ فِیْکُمْ"

لیکن اس سے خلافت علی پر استدلال کیا جانا کسی صورت سے صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس وقت رسول کریم کی پوزیشن ایک بے یار و مددگار "لیڈر" سے زیادہ نہ تھی۔ اور اس لئے ان جملوں سے اس موقعہ کے لحاظ سے جو کچھ مراد لی جا سکتی ہے وہ اس سے زیادہ نہ ہونا چاہئے۔ کہ حضرت علی کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ان کو اس حالت میں نبی کریم کا واحد معتمد علیہ قرار دیا گیا ہے۔

پھر جو طبقہ حضرت علی کی الٰہی امامت کا قائل ہے وہ اسی طرح حضرت حسن کی الٰہی امامت کو بھی مانتا ہے۔ اگر اس عقیدہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر میں پوچھتا ہوں کہ امام حسن کے اس "انتقام" کو سامنے رکھتے ہوئے جو آپ نے حضرت علی کے قاتل ابن ملجم سے لیا۔ اُن کی اخلاقی فضیلت کا کیا معیار قائم کیا جائیگا؟ ؎۱

میں اس سلسلہ میں زیادہ تفصیلی بحث کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن اتنا اور کہدینا چاہتا ہوں کہ "شیعیت" کی جانب سے حضرت علی کی الہامی امامت کو ثابت کرنے کے لئے جتنے دلائل پیش کئے جاتے ہیں وہ حقیقتاً اسلام کے بنیادی اصول سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں رکھتے۔ اس جھگڑے کا آغاز محض بعض مقامی پیچیدگیوں سے ہوا تھا۔ جن کو اس وقت کا ایا۔

؎۱ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ الکامل المبرد جلد سوم مطبوعہ مصر صفحہ ۱۲۶۔

بنانے کی خاطر مذہبی رنگ دیا گیا۔ اور جن کو اب غلطی سے مستقل مذہبی عقائد میں داخل کر لیا گیا۔

عربوں کی فطری "خاندانی عصبیت" کے ماتحت نبی کرمؑ کی وفات کے بعد بنو ہاشم کے ہر فرد نے اپنے موروثی جذبہ کے ماتحت اپنے خاندان کے ایک ممتاز فرد کو خلافت کا مستحق سمجھا اور اس کے لئے انہوں نے حضرت علیؑ کا نام پیش کیا۔ اس میں ان کو ناکامی ہوئی۔ پھر خلافتِ راشدہ کے ختم ہوتے ہی بدقسمتی سے حضرت معاویہ نے جس سلطنت کی بنیادیں دمشق میں استوار کیں۔ وہ خالص "بدوانہ" ذہنیت رکھتی تھی۔ ایران ہمیشہ سے ایک بلند اور مہذب حکومت رہی ہے۔ جنہوں نے ہمیشہ عربوں کو اپنے سے فروتر سمجھا ہے۔ لیکن جب اسلامی فتوحات نے ایران کو دمشق کے پایۂ تخت سے متعلق کر دیا۔ تو اہلِ ایران کی غیرتِ قومی اور حمیتِ ملی کے لئے یہ چیز سخت ناقابلِ برداشت تھی کہ وہ عربوں کے جور و استبداد کے سامنے اپنی گردنوں کو خم ہوتا دیکھیں۔[1] گو وہ زمانہ کی ناسازگاری کے ہاتھوں اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو واپس نہیں لے سکتے تھے۔ لیکن اپنے جذبات کے ماتحت عربوں سے انتقام لینے کے معمولی سے معمولی موقعہ کے منتظر تھے۔ اسلام نے خلافت کے مسئلہ میں جس بلند معیار کو قائم کر دیا تھا وہ اگر چالیسویں صدی ہجری میں حضرت علی کی شہادت کے بعد معاویہ کے بیرحم ہاتھوں سے تباہ نہ ہو چکا ہوتا تو وہ وقت کی ضروریات کے ماتحت مختلف ارتقائی دوروں سے گذرنے کے بعد آج دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ جمہوریت کے لئے بھی قابلِ رشک ہوتا۔ لیکن خلافت کے مسئلہ میں اس "انتخابی نظام" سے دنیا قریب قریب ناواقف تھی۔ ایران میں "وراثت" کا قانون نافذ تھا۔ انہوں نے عربوں سے بدلہ لینے کا یہ بہت اچھا موقعہ دیکھا۔ کہ حضرت علی کی الہامی نبوت کی آڑ میں خاندان اموی کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیں۔ چنانچہ بالآخر ۹۔ جون ۷۴۷ء کی صبح کو خراسان کے ایک گوشہ سے ابو مسلم نے عباسیوں کا سیاہ جھنڈا بلند کر دیا۔ اور گو عباسیوں کے دورِ حکومت میں ایران پوری طرح مطمئن نہ ہو سکا۔ لیکن جب چنگیز خاں کے حملہ کے بعد ایران میں ایک مستقل خود مختار حکومت کی بنیاد قائم ہوئی تو ایرانیوں کو دل کے پھپھولے پھوڑنے کا کافی موقعہ ملا۔ چنانچہ خاندان صفویہ اٹھا اور اس نے صحیح معنوں میں عربوں سے اس طرح انتقام لیا کہ سارے ملک کو بنوکِ شمشیر شیعیت کے رنگ میں رنگ دیا۔

یہی حال عبد اللہ ابن میموں القداح کی اس عظیم الشان تاریخی سازش کا ہے جس کے بعد مصر میں تقریباً دو سو برس تک بنو فاطمہ کے جھنڈوں کے نیچے شیعیت پرورش پاتی رہی۔[2]

---

[1] اس سلسلہ میں فردوسی کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ جو بتلاتے ہیں کہ راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے باوجود جب قومی اور ملی جذبہ کے ماتحت وہ ایرانیوں کے مقابلہ میں عربوں کا ذکر کرتا ہے تو کتنا "پرشور" نظر آتا ہے:۔

زشیر شتر خوردن و سوسمار عرب را بجائے رسید است کار
کہ تختِ کیاں را کنند آرزو تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:۔ مسلم تھیالوجی مصنفہ میکڈانلڈ۔

المختصر ان واقعات کی روشنی میں یہ حقیقت محتاج تشریح نہیں رہتی کہ خلافت و امامت کا مسئلہ نہ تو کوئی ایسا مسئلہ ہے جو آج درخور اعتنا کہا جا سکے۔ اور نہ "شیعیت" اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ۔ فقط

سید ابو سعید بزمی بھوپالی۔ بی اے

(نگار) :- "ہرنام" کے مضمون "مسئلہ خلافت و امامت" کا جواب متعدد حضرات نے بھیجا ہے۔ بعض نے نہایت سطحی و معمولی۔ بعض نے ایک حد تک تحقیقی و استدلالی۔ لیکن اس وقت تک کوئی مقالہ ایسا وصول نہیں ہوا۔ جس میں تمام جزئیات سے اسی تفصیل و ترتیب سے بحث کی گئی ہو جو ہرنام صاحب کے مضمون میں پائی جاتی ہے۔ بہر حال ان موصولہ مضامین میں ہم سب سے پہلے جناب بزمی بی اے کا مضمون شائع کرتے ہیں۔ مقالہ نگار نہ صرف انگریزی کے فاضل ہیں۔ بلکہ عربی علوم کے بھی فارغ التحصیل طالب علم ہیں۔ میں نے "مولوی" اس لئے نہیں کہا کہ اسوقت تک ان میں وہ جراثیم پیدا نہیں ہوئے ہیں جو ایک انسان کو اس اعجوبہ روزگار چیز میں تبدیل کر دیتے ہیں جس کو اگر ہم "مولوی" کے علاوہ کسی اور نام سے پکاریں تو نہ اس کی ہیئت ظاہری سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ اسکا بطون ـــــــ لیکن بہرحال ایک پابند مذہب شخص ہیں۔ اور گروہ اہل سنت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ ایک شخص ثالث کی حیثیت سے اس پر گفتگو کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اس نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کو دیکھنا شیعہ و سنی دونوں کو پسند نہیں آسکتا۔ بہر حال اس مضمون میں جس اصول کو سامنے رکھا گیا ہے وہ بھی مسئلہ خلافت پر کافی روشنی ڈالنے والا ہے۔ اس کے بعد ہم اور مضامین بھی شائع کرینگے اور سب سے آخر میں اپنی رائے پیش کرینگے۔

آئندہ اگر کوئی اور صاحب اس مسئلہ پر لکھنا شروع کریں تو انھیں ہرنام کا مضمون پڑھ کر یہ غور کر لینا چاہئے کہ اس کے استدلال کی بنیاد کن امور پر ہے۔ یعنی ایک یہ کہ جو روایات انہوں نے اہل سنت کی کتابوں سے پیش کی ہیں وہ واقعی ان کتابوں میں پائی جاتی ہیں یا نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ ان واقعات و روایات سے وہی نتیجہ نکلتا ہے یا نہیں جو ہرنام نے پیدا کیا ہے۔ اگر نتیجہ واقعی وہی نکلتا ہے اور روایات بھی اہل سنت کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں تو پھر یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ روایات صحیح ہیں یا نہیں۔ اور اگر صحیح نہیں ہیں تو اکابر اہل سنت نے کیوں ان کو اختیار کیا۔ یہ تو بحث کا وہ ضروری پہلو ہے جس کو ترک کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اب رہا مسئلہ کا نفسیاتی پہلو سو اس کو وہی شخص چھو سکتا ہے جو دونوں جماعتوں میں سے کسی سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ سو اس کو مجھ پر چھوڑ دیجئے۔

نیاز

آفتاب کی کرشمہ سازیاں

آبشاروں کا نظارہ کرنے والے ۔ مثلثی شیشوں کے دیکھنے والے اس امر کی شہادت دے سکتے ہیں کہ آسمان پر دکھلائی دینے سے پہلے نہ معلوم کتنے قوس قزح ان کی نگاہوں سے گذر چکے ہیں ۔ لیکن پچھلے زمانہ میں انسان ترقی و تہذیب کے میدان میں بچہ کی طرح تھا اس لئے اسکا یہ خیال کہ :۔

"قوس قزح فی الاصل وہ راستہ ہے جس پر سے مرنیوالوں کی روحیں عالم اعلیٰ کی طرف جاتی ہیں "

اس کی تسکین کے لئے کافی تھا ۔ اس کے بعد یہ دیکھ کر کہ وہ بارش کے موسم ہی میں اکثر دکھائی دیتی ہے ۔ اُس نے اپنا خیال کسی قدر بدلا اور یہ کہنا شروع کیا کہ :۔

"قوس قزح کا نمود پیغام الٰہی ہے کہ اب بارش نہ ہوگی "

لیکن یہ خیال صرف اس ملک کے انسانوں میں پیدا ہوا ۔ جہاں وقت بے وقت بارش ہوا کرتی تھی ۔ یا جہاں بارش کثرت سے ہوتی تھی ۔ مگر شعریت پسند یونانیوں کا خیال دوسرا تھا ۔ ان کے خیال میں "قوس قزح اصل میں وہ راستہ تھا ۔ جس پر سے خدا کے پیغامبر گذرا کرتے تھے" !

جب ارسطو نے اس قسم کے خیالات کو سنا تو بول اٹھا کہ "یہ شاعرانہ اعتبارات ہیں ورنہ قوس قزح روشنی ۔ نمی اور قطرات آب کے امتزاج کا دوسرا نام ہے "

مگر اسکا بیان دنیا کے لئے ناقابلِ قبول ٹھہرا ۔ کیونکہ روشنی و رنگ کا تجزیہ اس وقت تک ناممکن تھا ۔ اور لوگوں نے گذشتہ اقوال ہی پر اعتبار کرنا مناسب سمجھا ۔

کہا جاتا ہے کہ چودھویں صدی میں ایک عظیم المرتبہ راہب کو قوس قزح کا صحیح علم ہوگیا تھا ۔ مگر یہ خیال صرف عقیدتاً تھا ۔ ورنہ تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ اندلس میں الذغل نے اس سے بہت پہلے قوس قزح کی عقدہ کشائی کردی تھی ۔ اور اپنی تحقیقات سے یورپ کو آشنا کردیا تھا ۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ باوجود اس خیال کے موجود ہونے کے کہ :۔

"جہاں قوس قزح کی کمان ختم ہوتی ہے ۔ اگر کوئی پہنچ جائے تو اس کو ایک سونے کا پیالہ ملیگا "

انحق ۔ نیوٹن وغیرہ تجزیۂ رنگ میں مصروف تھے جس کا نتیجہ مابعد زمانہ میں یہ نکلا کہ شاعرانہ خیال میں سرگرم رہنے والے اپنی جگہ رہ گئے اور تحقیقات کرنے والوں نے وہ جواہرات حاصل کر لئے جو قوس کے رنگین طول و عرض میں پوشیدہ تھے۔ اور تمام دُنیا کو سمجھانے کے لئے یہ مثال پیش کی کہ :۔

"فرض کرو ایک مقابلہ کی دوڑ کا اس طرح انتظام کیا جائے کہ میدان کے وسط میں ایک "قوس نما" لوہے کی کمان اس طرح بنائی جائے کہ سب سے چھوٹا آدمی اس میں سے آسانی سے گذر جائے اور تمام دوڑنے والوں کے لئے یہ شرط ہو کہ ان کی وردیاں قد کے لحاظ سے الگ الگ رنگ کی ہوں۔ یعنی سب سے چھوٹے آدمی کی بنفشی یا نیلی ہو۔ متوسط کی پیلی اور قد آور کی سُرخ۔ اور جو سب سے پہلے "حلقۂ قوس" سے گذر جائے وہ قابل انعام ٹھہرے"

اس شرط کے بعد دوڑ شروع ہو۔ تم غور کر سکتے ہو کہ اس دوڑ کا کیا رنگ ہوگا۔ تمام دوڑنے والے حلقۂ مذکور سے گذر جانے کے لئے دوڑینگے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وردیوں کے اختلاط سے جو لہر رونما ہوگی وہ قوس قزح کی مکمل تصویر تو نہیں۔ لیکن دُھندلا سا خاکہ ضرور پیدا کر دے گی۔

مشاہدات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جب قوس قزح کی طرف دیکھا جائیگا تو سورج عقب میں ضرور ہوگا۔ جس کی شعاعوں کو ابخرات آلودہ ہوا سے گذرنا ہوتا ہے۔ مگر پانی کی بے شمار باریک باریک بوندیں ان کو روکتی ہیں۔ مگر وہ اُن سے لڑ بھڑ کر ہماری نگاہوں تک پہنچ ہی جاتی ہیں۔ اس تصادم کیوجہ سے جو لہر پیدا ہوتی ہے وہ شعاعوں کا عکس حاصل کر کے قوس قزح کا دائرہ بنا دیتی ہے

موجودہ تحقیقات سے یہ بات مان لی گئی ہے کہ سفید رنگ (اگر اسکو رنگ کہہ سکتے ہیں) تو ایسا رنگ ہے جو تمام رنگوں پر محیط ہے۔ اسی طرح یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ تھوڑی سے تھوڑی روشنی بھی چھوٹی اور بڑی لہروں پر مشتمل ہوتی ہے جن میں سے ہر ایک لہر جب نگاہ تک پہنچتی ہے۔ تو قوس رنگین بن جایا کرتی ہے۔ اسی کو "شکستگی نور" اور "انعکاس رنگین" بھی کہہ سکتے ہیں۔

بعض وقت جب روشنی کو قدرے کثیف فضا سے گذرنا پڑتا ہے تو چھوٹی کرنیں بنفشی رنگ لئے ہوتی ہیں۔ اور پہلے گذر جاتی ہیں۔ سب سے بڑی کرنیں جو نگاہوں کو سُرخ معلوم ہوتی ہیں۔ سب سے آخر میں گذرتی ہیں۔ انھیں تبدیلیوں کا دوسرا نام مشرقی ممالک میں غروب آفتاب کے وقت شفق ہے۔ اور مغربی ممالک میں "شعلۂ سما"۔

اسی طرح اور بالکل اسی طرح ابخرات آلودہ ہواؤں میں ننھی ننھی بوندیوں کے اثر سے تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں۔ بعض تبدیلیوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم آسمان کو نیلگوں کہتے ہیں۔ اور بعض کی وجہ سے قوس قزح کے متعدد دائرے نظر آنے لگتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ :۔

"جب ابخرات آلودہ ہواؤں سے شعاع گذرتی ہے تو وہ ذرات ہوا جو بوندوں سے بڑے ہوتے ہیں اُن نیلی شعاعی لہروں کو جذب کرکے ہماری نگاہوں تک واپس کردیتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ آسمان نیلگوں ہے۔"

بجنسہٖ جب پانی کی بوندیں شعاعی لہروں کو روک کے اُن کے زاویۂ خاص سے منعطف کردیتی ہیں۔ اور بلحاظ طول وعرض ان کو ہماری نگاہوں تک واپس کردیتی ہیں۔ اگر روشنی کی قوت زیادہ ہوتی ہے تو قوس قزح کا ایک دوسرا دائرہ مرکزی دائرے کے پیچھے بن جاتا ہے۔ اسی طرح "کرشمۂ نور" کی نیرنگیوں کی بدولت ایک سے زیادہ دائرے بن سکتے ہیں۔

ان کوائف کی موجودگی میں قوس کی رنگین کمان تک پہنچکر "سونے کا پیالہ" حاصل کرنا بالکل بے معنی ہے۔ کیونکہ اسکا وجود ہے۔ لیکن اس کی کوئی انتہا نہیں۔ اس لئے کہ ہم سے کچھ فاصلہ پر ابخرات آلود ہواؤں کا وجود ممکن اور اس سے روشنیوں کا گذرتے رہنا یقینی ہے۔ پس قوس پر قوس کی رنگینیوں کا بنتے اور بگڑتے رہنا بھی لازمی ہے۔

قوس قزح کی طرح ہالوں کا بھی وجود ہے۔ جو "شکستگی نور" کی وجہ سے سورج۔ چاند اور دیگر بڑے ستاروں کے گرد دیکھے جاتے ہیں۔ لیکن ہالۂ قمر کا سمجھ لینا بہ نسبت سورج یا دیگر ہالوں کے مشکل نہیں ہے۔ کیونکہ ہالۂ قمر کی مثال کہر والی راتوں میں ان قندیلیوں کے گرد مل سکتی ہے جو سڑکوں کے کناروں پر جلتی ہیں۔ لیکن ہالہ جب متشکل ہوتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ پانی کی بوندیں روشنی کو روکتی ہوں۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ یہی بوندیں روشنی کو منتشر بھی کردیتی ہیں۔ اور منعکس بھی۔ منتشر اس طرح کہ بوندیں جس قدر طول وعرض میں خود منتشر ہوتی ہیں اسی قدر "جذب نور" میں انتشار وبُعد پیدا ہوجاتا ہے۔ اور منعکس اس طرح کہ بوندیں اپنی شفاف آغوش میں شعاعوں کو جذب کرتی ہیں جس سے بالکل اسی طرح انعکاس پیدا ہوجاتا ہے۔ جیسے آئینہ کو سورج کے سامنے رکھ کر کسی اور طرف عکس ڈالتے وقت رونما ہوتا ہے۔

جہازران چاند کے ہالوں کو دیکھ کر طوفان یا بارش کی آمد کا خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ چاند اپنی منتشر روشنی کے ذریعہ اُن پانی کی بوندوں کو خبر دیتا ہے۔ جو بادلوں کے بننے سے پہلے ہوا میں پوشیدہ رہتی ہیں۔

"شکستگی نور" ہی کی وجہ سے سورج کے گرد بھی ہالوں کا وجود موسم سرما میں نظر آتا ہے۔ کیونکہ اس موسم میں چھوٹے چھوٹے برف کے ذرات۔ یا منجمد آبی قطرے فضا میں موجود رہتے ہیں۔ موسم گرما میں ان کا وجود کمیاب ہوتا ہے۔ لیکن سورج کے ہالوں کا معائنہ بغیر کسی آلۂ شعاعی کے بہت مشکل ہے۔

ہالوں کے علاوہ فضا میں ایک اور چیز موجود پائی جاتی ہے جسکو "گرد رقصاں" کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ بھی شکستگی شعاع کا ایک کرشمہ ہے۔ اس "گرد رقصاں" کی وجہ سے بھی بہت سے ہالوں کا وجود ہوتا ہے۔ چنانچہ ۱۸۸۳ء میں جب کراکٹی (Karakti) کوہ آتش فشاں کے پھٹنے کی وجہ سے کئی ہفتہ تک گرد سے فضا تاریک رہی تو بہت سے رنگین حلقے سورج کے گرد دیکھے گئے۔ اس قسم کے حلقوں کو ازمنۂ ماضی میں شگون بد سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اور اب بھی کسی حد تک اسکا خیال عوام میں باقی ہے۔ لیکن سنجیدہ طبقہ اب ان نشانات وارتسامات کو فضاء و نور کے معصوم کھیل کے سوا کچھ نہیں تصور کرتا۔

حافظ۔ غازی پوری

باب المراسلۃ والمناظرہ

اختر ریحانہ کی آپ بیتی

نیاز صاحب، تسلیم!

مئی کے نگار میں آپکا نوٹ پڑھا۔ آپ لکھتے ہیں "اختر ریحانہ سے" لیکن اس کے فوراً ہی بعد "جناب ابو رشید صاحب سے" سوچتی رہی کہ ایک طرف تو یہ طرزِ خطاب اور دوسری طرف ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو مجھ سے ہمدردی نہ رکھتا ہو! حیرت!! خیر۔ مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔ جبکہ میری زندگی کے بہت کم لمحے ایسے ہیں جو اسی قسم کے متضاد تجربات سے خالی ہوں۔

نیاز صاحب! آپ کی تحریر سے ایک خاص قسم کا عتاب ٹپکتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں کیوں آپکے لئے وجہ تفکر بنی۔ آپ کو یقین آئے یا نہ آئے لیکن خدا کی قسم میں نے آپکو جو کچھ لکھا تھا وہ صرف میرے دل کی تڑپ تھی۔ جو بے ساختہ قلم سے نکل پڑی تھی۔ میرے فرشتوں کو بھی یہ گمان نہ تھا کہ آپ اسے شائع کرینگے۔ مجھے اب تک اسکا قلق ہے لیکن کیا کروں۔ زندگی میں اگر ایسی حماقتیں سرزد نہ ہوں تو قسمت کو کون روئے۔

نیاز صاحب! آپ فرماتے ہیں کہ میں اپنا نقاب چاک کرکے دوسری جنس کو تلافی کا موقع دوں۔ لیکن خدارا مجھے یہ تبلا دیجئے۔ کہ کیا ان "ہمدردوں" کے لئے ہندوستان کے سولہ کروڑ کمزور بے زبان متحرک مجسموں میں صرف ایک اختر ریحانہ ہی ہمدردی کی مستحق رہ گئی ہے۔ للہ ان سے پوچھئے کہ وہ اپنے شہر۔ اپنے محلے، اور اپنے گھر میں اُن بیسیوں تڑپتی ہوئی لاشوں کی طرف نظر کیوں نہیں کرتے جو صرف انھیں کی بے اعتنائیوں اور کم نگاہیوں کا شکار بنی موت کی سسکیاں لے رہی ہیں۔؟ —— وہ ہزاروں شوہر جنھوں نے اپنی نظرِ التفات کا جائز یا ناجائز مرکز دوسری عورت کو بنا کر ایک معصوم مورتی کو رُلا رکھا ہے۔

وہ بے شمار نوجوان جو سینکڑوں جھوٹے وعدوں کیساتھ عورت کا سب کچھ لوٹ کر بے اعتنائی کے ساتھ احباب کی مجلسوں میں بیٹھے سرگرم عشرت ہیں۔ وہ ہزاروں "بلند ذوق" لڑکے جو مقصود حاصل کرلینے کے بعد والدین کی اطاعت اور اخلاق کی پاکیزگی کی آڑ میں اپنے شکار کو تڑپتا چھوڑ چکے ہیں۔ وہ بیسیوں بلند حوصلہ طلبہ جو ادیبانہ انداز سے تقریر وتحریر میں اپنے ایثار کو لوٹ چکنے کے بعد "تعلیمی مشغولیت" کے پردے میں شادی سے ہمیشہ کے لئے انکار کر چکے ہیں ——— ہاں تو یہ سوسائٹی کے "ہونہار سپوت" اگر تلافی کے خواہاں ہیں تو اٹھ کر اپنی غلطیوں کا جائزہ کیوں نہیں لیتے؟

نیاز صاحب! میں اپنی زندگی سے بیزار ہوں۔ لیکن قاضی عبدالغفار صاحب کی "لیلیٰ" کی طرح اس لئے نہیں کہ میں کسی ایک مرد سے متعلق ہوکر کئی بچوں کی ماں کیوں نہ بنی۔ بلکہ صرف اس لئے کہ آخر یہ مرد مجھے اپنی طرح کا انسان کیوں نہیں سمجھتے؟

نیاز صاحب! کتنے ہیں ایسے ادیب۔ انشاپرداز۔ لیڈر۔ ایڈیٹر۔ اور اخبار نویس جو پند ونصائح کے دفتر کے دفتر دن رات کھولتے رہتے ہیں۔ جو بلند سے بلند سوسائٹی کے مہذب رکن بنے پھرتے ہیں۔ جو لوگوں کی نظروں میں عزیز ہیں۔ حالانکہ اُن کے چنگل کا ہر ناخن بے گناہ لڑکیوں کے خون سے رنگین ہے۔ پھر آپ کہتے ہیں کہ یہ ان کا ذاتی فعل ہے۔ جو اُن کے لیڈرانہ فرائض سے علیحدہ ہے۔ اُن کی ان دونوں زندگیوں کو نہ ملاؤ۔ مجھے اس کلیہ کے ماننے میں کوئی تامل نہیں ہے۔ لیکن للہ جب اس کے ماتحت مردوں کو سوسائٹی کے طعن سے نجات مل سکتی ہے۔ مولانا عبدالماجد کی "مولانائیت" بدستور قائم رہ سکتی ہے۔ مولانا عرفان اور مولانا شوکت علی کی لیڈری میں کوئی فرق نہیں آتا۔ تو پھر کیا اختر ریحانہ کی بہنیں انسان نہیں ہیں۔ کہ میونسپلٹی کے قوانین۔ پولیس کے سپاہی۔ تھانیداروں کی قہر آگیں نگاہیں۔ اور لیجسلیٹو اسمبلیوں کے "قوم پرست" اراکین کے "اصلاحی بل" انھیں کے لئے وقف ہوں!

نیاز صاحب! آپ لکھتے ہیں "نگار کے صفحات کو جولانگاہ عشق نہیں بنایا جاسکتا" یعنی؟ کیا یہ نگاہ گرم مجھ پر ہے؟ حیرت!! کیا آپکے نزدیک میں اب بھی اتنی نادان ہوں کہ عشق کو نہ سمجھ سکی؟ میرے خیال میں برنی صاحب نے اپنے مضمون میں جو سب سے بڑی چیز چھوڑ دی ہے وہ یہی ہے کہ ——— لوگ کسبی کو صرف اس لئے بُرا کہتے ہیں کہ اسے چند چاندی کے ٹکڑوں اور جھوٹے آنسوؤں سے مرعوب کرکے اپنی کنیز نہیں بنایا جاسکتا۔ اور برخلاف اسکے ایک "معصوم" لڑکی جھوٹی محبت ہی کے فریب میں آکر گردن ڈالدیتی ہے۔

نیاز صاحب! میں کہنا تو نہ معلوم کیا کیا چاہتی ہوں۔ لیکن ڈرتی ہوں ——— آپ سے ادیب سے ——— اپنی زندگی کا ایک ورق بھیج رہی ہوں۔ اس کے بعد آپ مجھے مُردہ سمجھیں۔ استفسار حال کروانے

"ہمدرد" میری تلاش میں سرگرداں نہ ہوں —— دنیا کے کسی گوشہ میں پڑی اپنی لاکھوں بہنوں کی طرح زندگی کے دن کاٹ رہی ہوں۔ کاش برنی صاحب اس ٹوٹے ہوئے ساز پر مضراب نہ لگاتے :

اختر ریحانہ کی زندگی کا ایک ورق

مجھے اُن سے شرم آتی تھی۔ میں ان سے چھپی چھپی پھرتی تھی۔ مگر جب ان کو موقع ملتا وہ میری کتاب میں خط چھپا جاتے۔ آخر میری خاموشی کو دیکھ کر ایک دن ایک مختصر سا پرچہ رات کو سوتے وقت وہ میرے پاس پھینک گئے۔ لکھا تھا "جب میری زندگی کی بہار مجھ سے بیزار ہے۔ میری تمناؤں کی دیوی مجھ سے کنارہ کش ہے۔ تو پھر میں کیوں زندہ رہوں۔ صبح آپ میری لاش دیکھیں گی"۔ مجھے اس وقت کیا خبر تھی کہ اس قسم کے دعوے محض مکر و فریب کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں گھبرا کر اٹھی۔ کمرہ میں ٹہلتی رہی۔ پھر چپکے ان کے کمرہ کی طرف گئی۔ وہ کرسی پر سر پکڑے بیٹھے تھے۔ میں واپس چلی آئی۔ کئی دفعہ گئی اور واپس آگئی۔ بالآخر بارہ بجے کے قریب میں دل سخت کر کے ان کے کمرہ میں داخل ہوگئی۔ انہوں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔ "کیا ارادہ ہے؟" اُن کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ کھڑے ہوگئے۔ ایک کاغذ کھول کر کہنے لگے "سنگدل ہے ریحانہ تم کچھ بھی ہوگی ...." بہت سے ادیبانہ جملے دُہراتے رہے۔ میں دم بخود میز سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ وہ اٹھے۔ کواڑ بند کئے اور میرا بازو پکڑ کر کہنے لگے۔ "میری معبودہ ...." میں بیٹھ گئی۔ میں آہستہ آہستہ ان کی ہو رہی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری تھی۔ بالآخر .... میں واپس آئی تو اپنی امانت انھیں سونپ چکی تھی۔

لیکن چند دن بعد ہی مجھے دُنیا بدلتی نظر آنے لگی مجھے ان کے طرز عمل پر شبہ ہونے لگا تھا۔ میں نے ان سے شکایت کی لیکن انہوں نے بات ٹالدی۔ لیکن جب میں نے واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ تو میرا دماغ کھولنے لگا۔ میں نے اُن سے شکایت کی۔ بولے "یہ زندگی کی رومانیت ہے۔ تم مجھ سے بدگمان کیوں ہوتی ہو"۔ لیکن اب آندھی اُٹھ چکی تھی۔ بادل رفتہ رفتہ چھٹ رہے تھے۔

.... میں نے اس زندگی کو چھوڑا، اس لئے مجھے —— یہ ایک لچر سی گفتگو ہے۔ لیکن ہاں مجھے اس حادثہ کی خبر نہ تھی۔ اس دن "" صاحب" سے سخت گفتگو ہوئی۔ دوسرے دن تھانیدار صاحب تشریف لائے۔ فرمانے لگے۔ "آپ کون ہیں؟"

میں نے کہا۔ "میں اس وقت تک جواب دینا نہیں چاہتی جب تک آپ مجھے یہ نہ بتلادیں کہ آپ کے اس سوال کا

مدعا کیا ہے"؟

بولے - " میں پوچھتا ہوں تم کون ہو - کہاں سے آئی ہو - تمہارے ساتھ کون ہے"؟

اُس نے سوالات کا تانتا باندھ دیا - اس کی آواز میں بتدریج خشونت پیدا ہو چلی تھی - میرے جسم کا ریشہ ریشہ کانپنے لگا - میں نے سمجھا - شاید میری موت کی ساعت قریب آگئی ہے - میں سکتہ کے عالم میں اسکا مُنہ تکنے لگی - وہ پھر بولا :-

" اچھا عیاشی کرنا ہے تو ...." میں جاؤ - یہاں رنڈیاں نہیں رہ سکتیں - چوبیس گھنٹہ میں یہاں سے چلی جاؤ - ورنہ کوتوالی میں بیٹھی نظر آؤ گی "-

میرے حواس گم ہو گئے - میرے لئے زندگی میں پہلا موقعہ تھا کہ اس طرح ڈانٹی جاؤں - میں نے سہمی ہوئی آواز میں کہا " لیکن آپ مجھے سمجھ کیا رہے ہیں"؟

بولا - " جو کچھ آپ ہیں - سب کو معلوم ہے - میں نے جو کچھ کہدیا ہے اس سے آپ کیلئے مفر نہیں ہے"

اس کے بعد میں نے پہلی ٹرین سے "ب" کو تو ضرور چھوڑ دیا - لیکن میرے لئے غور وفکر کی ایک بالکل نئی شاہراہ کھل گئی - راستہ بھر اسی اُدھیڑ بُن میں لگی رہی کہ کہاں جاؤں اور کیا کروں - سوچتی تھی کہ آج یہ ماجرا کیا ہے - میں نے ایک مرتبہ بھی علانیہ طور پر اپنی متاع کو بازار میں نہیں چُنا - لیکن پھر بھی میرے اُوپر یہ عتاب - لیکن اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب تھا -

---

میرا سب سے بڑا گناہ یہ تھا کہ میں نے شادی کیوں نہیں کی - میں نے کہا " دُنیا کے بڑے بڑے انسان غیر شادی شدہ ہیں " بولے " مگر عورت کے لئے یہ جائز نہیں " - میں نے کہا " کیوں " ؟ بولے " اسی لئے کہ وہ عورت ہے " - میں نے کہا - " تو عورت کا سب سے بڑا جرم اسکا عورت ہونا ہے " ؟ بولے " ہاں " -

اس پر میں کیا کہتی - وہ خفا ہو کر چلے گئے - اور میں دیر تک سناٹے میں بیٹھی رہی -

اختر ریحانہ

(**نگار**) آپ نے جن واقعات و حالات کو اپنے " ورق زندگی " کے نام سے پیش کیا ہے - اُن کے متعلق تو مجھے کچھ نہیں لکھنا سوائے اس کے کہ اگر آپ کی موجودہ معاشرت و معیشت حقیقتاً نتیجہ ہے اس اوّلین فریب کا جو جھوٹی محبت کے جھوٹے آنسوؤں کے پردہ میں آپ کو دیا گیا تو میں کیا ساری دُنیا کو آپ سے ہمدردی ہوگی - درآنحالیکہ دُنیا میں ایسے واقعات بھی مل سکتے ہیں کہ مرد نے جس عورت کو گلے کا ہار بنایا اسی نے ناگن بن کر اُس کو ڈس لیا - لیکن سوال اس وقت تو صرف یہ ہے کہ اب جبکہ اپنی موجودہ زندگی کی تلخیوں کو آپ اچھی طرح محسوس کر رہی ہیں - کیوں اس کے چھوڑنے پر آمادہ نہیں ؟ اگر اس سے مقصود مرد سے انتقام ہی لینا ہے - تو مجبوری ہے - ورنہ محض سوسائٹی کے رسم و رواج کو بہانہ بنانا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا - جبکہ ہزاروں با

یہ رواج اس سے قبل توڑا جا چکا ہے۔ اور آیندہ بھی برابر ٹوٹتا رہیگا۔ اگر واقعی کوئی عورت محبت کا سچا رشتہ جوڑنے کیلئے تیار ہے، رہا آپکا تلخ تجربہ سو دنیا میں یہ کوئی نیا تجربہ نہیں۔ عورتوں سے پوچھئے تو وہ سو مثالیں اس کی مردوں میں سے پیش کر دینگی۔ اور مرد سے دریافت کیجئے تو وہ بھی ہزاروں مثالیں عورتوں سے پیش کر دیگا۔ لیکن باینہمہ ناستواری عہد وفا کا خیال دنیا سے مٹ نہیں سکتا۔ اور مٹے کیونکر جبکہ آپکا مجھ سے کٹکر کسی دوسرے سے مل جانا اسکا امکان بھی رکھتا ہے کہ آپ پھر اس سے کٹکر مجھ سے مل رہیں ؎

زما گسستی و با دیگراں گرو بستی　　بیا کہ عہد وفا نیست استوار، بیا

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنی اذیت و تکلیف کو بہت زیادہ اہم سمجھتا ہے۔ اور کبھی اس بات کو نہیں دیکھتا کہ دنیا کا کوئی تلخ واقعہ ایسا نہیں ہے جس سے تلخ تر کوئی اور پہلے نہ گذر چکا ہو۔ قدرت کا ترکش تیروں سے بھرا ہوا ہے۔ اور اسے یہ بھی خبر نہیں کہ کون تیر کتنا سم آلود ہے۔ آنکھ بند ہے اور تیر پر تیر چٹکیوں سے چھوڑے جا رہے ہیں۔ پھر یہ بھی اتفاق ہے کہ جس کو واقعی بہت زیادہ تڑپنا چاہیے۔ اس کو وہ صرف چھوتے ہوئے گذر جاتا ہے۔ اور جو یونہی پہلے سے خراب و خستہ ہے اسکا دل چھلنی کر کے رکھ دیتے ہیں۔ الغرض یہ ضرور نہیں کہ آپ کا دل سچی محبت کا طلبگار ہو تو اس کو مکر و فریب سے کبھی واسطہ ہی نہ پڑے اور میں کہ یکسر مکر و فریب ہوں۔ مجھے کوئی سچی محبت کرنیوالا کبھی ملے ہی نہیں۔ اس لئے اگر واقعی آپکو کسی مرد کی بیوفائی کی طرف سے سخت صدمہ پہنچا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ مرد کی پوری جنس کو ایسا ہی نامعقول سمجھنے لگیں۔ کیونکہ اگر اس قسم کی دلیل سے کام لیا گیا تو پھر مردوں کو بھی عورت کی تمام صنف کو مکار و بیوفا سمجھنے کا حق حاصل ہوگا۔ درآنحالیکہ آپ اور وہ دونوں ایسا سمجھنے میں غلطی کرینگے۔

ہرچند یہ ایک حد تک درست ہے کہ عورت کی لغزش کو ایک مرد مشکل سے معاف کرتا ہے۔ اور خود اپنی لغزش کے متعلق وہ یہ چاہتا ہے کہ عورت اسے بھلا دے۔ گوارا کر لے۔ لیکن اگر آپ غور کرینگی تو معلوم ہوگا کہ مرد کا تفوق اسی کا مقتضی ہے اور مظلوم کا احتجاج ایک ظالم کیخلاف ہمیشہ بے معنی ہوا کرتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مرد کا یہ سلوک عورت کیساتھ درست ہے۔ لیکن وہ درست ہو یا نادرست اسکا علاج عورت کے پاس کچھ نہیں۔ اور اسے یہ تمام مظالم برداشت کرنا پڑینگے۔ جب تک وہ ہر چیز میں مرد کے برابر نہ ہو جائے۔ اور مرد سے بے نیاز ہوکر وہ دنیا میں اتنی ہی ترقی نہ کر لے جتنی مرد نے کی ہے۔ خیر۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو خواہ مخواہ آپ کی تحریر کو دیکھ کر زبان سے نکل گئیں۔ اصل مدعا تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ آپنے اپنے خط میں جو کچھ لکھا ہے وہ کس حد تک مناسب ہے۔ اور اس میں آپ نے اپنا کیا فائدہ سوچا ہے۔

سب سے پہلے تو میں آپ کی اس غلطی کو رفع کرنا چاہتا ہوں کہ ابو رشید کی جس تحریر کا جواب میں نے مئی کے رسالہ میں دیا ہے۔ اس سے آپکا کوئی تعلق نہیں۔ وہ ایک بالکل علیحدہ مسئلہ ہے۔ اور صرف اس لئے کہ باب المراسلۃ میں

آپ کی تحریر کے بعد ہی وہ بھی درج کر دیا گیا۔ آپ کو برہم ہونے کی ضرورت نہیں۔

آپ کو دوسری شکایت یہ ہے کہ میرے جواب میں آپ نے عتاب و سرزنش کا انداز محسوس کیا۔ درآنحالیکہ یہ بالکل خلافِ حقیقت ہے۔ باور کیجئے کہ آپ کیا دنیا کی ہر عورت خواہ وہ کسی طبقہ و درجہ سے متعلق ہو۔ انفرادی طور پر میری برہمی کے حدود سے بہت بلند ہے۔ اور آجتک میری زندگی میں کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گذرا کہ کسی عورت کی طرف سے جذبۂ غضب و انتقام کی پرورش میں نے اپنے دل میں کی ہو۔ میں عورت سے محبت نہیں بلکہ اسکی پرستش کرتا ہوں۔ اور اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہوں کہ نوع انسانی کی نجات صرف عورت ہی کی اصلاح پر منحصر ہے۔ اس لئے یہ تو ہو سکتا ہے کہ فرطِ تاثر سے کوئی بات ایسی منھ سے نکل جائے جسے آپ زیادہ سے زیادہ "واسوخت" کہہ سکیں۔ لیکن غصہ و برہمی کا اظہار تو مجھ سے اس وقت بھی ممکن نہیں جب وہ اوروں کے نزدیک فرض کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

آپ کی تحریر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کیا تھے جو ہمدردی لوگوں کو پیدا ہوتی ہے آپ اس کے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ بہتر ہے آپ قبول نہ کیجئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جو چیز آپ کو پسند نہیں وہ دنیا کی اور تمام عورتوں کے لئے کیوں پسند فرماتی ہیں۔ اور آپ کیوں ساری دنیا کی عورتوں کا درد اپنے دل میں لئے ہوئے کڑھ رہی ہیں۔ جبکہ آپکو یقین ہے کہ مرد کبھی اپنی ریاکاری سے باز آنیوالا نہیں اور نہ عورت باوجود اتنی تعلیم و فراست کے فریب محبت میں مبتلا ہونے سے اپنے آپ کو بچا سکتی ہے۔ یاد رکھئے جس وقت تک عورت میں یہ احساس باقی ہے کہ مرد کوئی ایسی چیز بھی دے سکتا ہے جو عورت کے پاس نہیں ہے اور جب تک مرد کو عورت کی اس کمزوری کا علم ہے۔ یہی ہنگامہ قائم رہیگا اور سچ پوچھئے تو کائنات کی رونق اسی پر قائم ہے۔ اگر آج دنیا میں کوئی مرد یہ کہنے والا باقی نہ رہے کہ "میں تم پر جان دیتا ہوں" اور کبھی عورت کی زبان سے یہ سننے میں نہ آئے کہ "میں تمہاری ہوں" تو آپ ہی بتائیے کہ آپ کا جی ایسی خشک دنیا میں لگ سکتا ہے جہاں صرف پیغمبر ہی پیغمبر بس سکیں۔ رہ گیا سوال مکر و فریب کا۔ دغا یا عدم خلوص کا۔ سو اس کے متعلق اب کیا کہوں سوائے اس کے کہ یہ الفاظ بھی ہمارے ہی وضع کئے ہوئے ہیں۔ اور ہمیں نے ان کو ایک خاص مفہوم دے رکھا ہے۔ ورنہ فطرت کا تو یہ حال ہے کہ اگر وہ ایک قزاق کی خون آلود تلوار کو دیکھکر قہقہہ لگاتی ہے۔ تو ایک بیکس و مظلوم کی آہ و زاری سنکر بھی مسکرانے سے باز نہیں رہتی۔ ہماری سوسائٹی ہے۔ ہمیں نے کچھ قوانین اسکے وضع کر لئے ہیں۔ پھر اگر ہم ہی ان کو توڑ دیں تو شکایت کی کونسی بات ہے۔ یہ شکست و ریخت۔ یہ تعمیر و تخریب تو برابر اسی طرح جاری رہیگی۔ اور قدرت کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ کرۂ ارض میں "کروبیان ملاءِ اعلیٰ" کو بسا کر اپنی تفریح کھو بیٹھے۔ اگر وہ "نحن نسبح بحمدک" سے خوش ہوتی تو باوجود اس علم اور پیشین گوئی کے کہ انسان بجز فساد اور خون بہانے کے دنیا میں اور کچھ نہ کریگا۔ کیوں اس کو دنیا کی آبادی کے لئے منتخب کرتی۔ آپ کو معلوم ہوگا جب خدا نے انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر بھیجنے کا مقصد ظاہر کیا تو فرشتوں نے یہی کہا تھا کہ اس کے مستحق تو ہم ہیں۔ جو رات دن تیری حمد و ثناء

میں مشغول رہتے ہیں۔ نہ کہ انسان جو بجز فتنہ و فساد کے کچھ نہ کریگا۔ اس اعتراض کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ "انی اعلم ما لا تعلمون" یعنی تم اسکو کیا جانو۔ مجھے معلوم ہے کہ ایسا کیوں کیا جاتا ہے ـــ معلوم نہیں مفسروں نے اسکو کیا سمجھا۔ اور کیا بیان کیا ہے۔ لیکن میں اس "کیوں" کا مفہوم صرف یہی قرار دیتا ہوں کہ دُنیا کی رونق اور کائنات کی چہل پہل فتنہ و فساد ہی پر قائم ہے۔ معصیت و عدوان ہی سے وابستہ ہے۔ اور "سبوحٌ قدوسٌ" سنتے سنتے شاید خدا کو بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ "دیکھوں تو یہی مجھے سراپا بیان کرنیوالے کیا کیا دلچسپ حرکتیں کرتے ہیں"۔ اور ہو سکتا ہے کہ اپنے خمسان عفو و کرم کے مقابلہ میں "دریائے معاصی کی تنک آبی" کا تماشہ دیکھنا منظور ہو ـــ بہرحال اگر آپ یہ چاہیں کہ دُنیا میں جتنے مرد ہیں وہ جُنید و بایزید ہو کر رہ جائیں تو ناممکن ہے۔ جبکہ ہر عورت رابعہ بصری ہونے کیلئے تیار نہیں۔ جب تک عورتوں میں کلیوپیٹرا پیدا ہو سکتی ہے۔ ان کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ مردوں میں نیرو کی پیدائش پر اعتراض کریں۔ اس لئے یہ شکوہ و شکایت بالکل بیکار بات ہے۔ اگر آپ عورتوں کی مظلومیت کی تلافی مردوں سے چاہتی ہیں تو اسکی ترکیب یہ نہیں ہے کہ مردوں کے ہاتھ میں تسبیح دیکر رات دن نمازیں پڑھوایا کریں۔ کیونکہ اس بھیس میں وہ بہت زیادہ خونخوار ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس کی تدبیر صرف یہ ہے کہ عورتوں میں "لقمۂ تر" بننے کی صلاحیت کو کم کریں۔ تاکہ مرد اُن کو آسانی سے نگل نہ سکے۔ اور یہ صرف اس طرح ممکن ہے کہ یا تو آپ "اخلاق" کا مفہوم بدلکر اسکو اتنا پست و ادنیٰ کردیں کہ عورت بجائے "لقمۂ تر" کے "لقمۂ [illegible]" بن جائے اور مرد کے لئے اس میں کوئی دلکشی و دلچسپی باقی نہ رہے۔ یا پھر میدانِ عمل میں آکر اتنی ترقی کرلیں کہ مرد کے ہاتھ پاؤں توڑ کر ایک جگہ بٹھا دیں اگر یہ زیادہ مشکل ہے تو وہی سہی۔

آپ نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ آئندہ آپ کسی قسم کی خط و کتابت نہ کرینگی۔ اور یہ بھی تقاضا ہے کہ آپ کو مُردہ سمجھ لیا جائے۔ سو معاف فرمائیے مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ کیونکہ آپ کو مُردہ سمجھنے سے دُنیا کی زندہ دلی ختم ہو جاتی تو بھی خیر کوئی مضائقہ نہ تھا۔ لیکن جب یہ ہوتا نہیں تو پھر کیوں اس شگونِ بد کو گوارا کیا جائے۔ علاوہ اس کے میرے بعض احباب دہلی کے، آپ کی تحریروں میں ادب انشاء کی خاص کیفیت محسوس کرتے ہیں اور وہ آسانی سے اپنے صوبہ کے اس فخر کو زائل ہوتے ہوئے منظور نہ کرینگے۔ رہ گیا میں۔ سو ہر چند اس لحاظ سے کہ "دعوتِ آب و ہوا" کی جرأت نہیں رکھتا۔ نہ مستحق خطاب ہوں نہ رائے زنی کا اہل۔ تاہم اسکا کیا علاج کہ ہنوز آنکھوں میں دم باقی ہے۔ اور جی یہی چاہتا ہے کہ "ساغر و مینا" کو کم از کم دیکھتا ہی رہوں۔ اگر ان کو ہاتھ سے چھو نہیں سکتا ـــــــــــ چنانچہ، آپ کی تحریر دیکھی تو بے اختیار یہ چند سطریں قلم سے نکل بھی گئیں۔ ورنہ اس عمر میں کہ انسان "حسن و عشق" کی باتوں کو بھی "ریاضی و معاشیات" کے اصول سے دیکھنا چاہتا ہے اور اس موسم میں کہ گرمی نے یکسر دماغ کا توازن درہم برہم کر رکھا ہے۔ میرے لئے ناممکن تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے بھی "قدر خود بشناس" کی حد سے گذر کر اُن حدود میں پہنچ جاؤں۔ جہاں کی ہر چیز با وجود آشنا ہونے کے بھی اب نا آشنا سی معلوم ہوتی ہے ـــ پھر اگر آپ کو اتنی رعایت بھی منظور نہیں تو مجبوری ہے۔

ورنہ ضرور کبھی کبھی اپنے جذبات کے رجحان سے مطلع فرماتی رہیئے۔ دُنیا سے اس قدر مایوس و متنفر ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ ممکن ہے کوئی ایک ہی شخص آپ کی ہدایت پر عمل کرنے کیلئے تیار ہوجائے۔ اور اسی کے ساتھ مجھ پر بھی خشونت و برہمی کا الزام قائم نہ کیجئے۔ کیونکہ باوجود ویرانیوں کے بھی دل میں ہنوز وہ کیفیت باقی ہے کہ علی الاعلان نہیں تو کم از کم چپکے سے آپ کے کان میں اس کے متعلق یہ کہنے میں تامل نہیں ہوسکتا کہ :-

خرابہ ایست ولیکن درد ہوائے خوش ست

ایک مطبوعہ کارڈ اس رسالہ کے اندر ملفوف ہے

آپکو سوائے اسکے کچھ نہیں کرنا کہ صرف اپنے دستخط ثبت فرما کر ڈاک میں ڈلوا دیجئے۔ آپکا نمبر خریداری خود ہم نے کارڈ میں درج کردیا ہے۔ اگر

مکتوبات نیاز

کی خریداری منظور ہے تو نمبر (۲) کو کاٹ دیجئے ورنہ نمبر (۱) کو

ادب و انشاء کے لحاظ سے ان خطوط کو جو مرتبہ حاصل ہے اُس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ اس مجموعہ میں وہ خطوط بھی ہیں جو "نگار" میں شائع نہیں ہوئے۔ یہ کتاب ۲۸ پونڈ کے دبیز کاغذ پر مجلد شائع کی گئی ہے۔ اس میں نیاز فتحپوری کی تصویر بھی شامل ہے اور ان کی تحریر کے بلاک بھی۔ ضخامت ۲۸۸ صفحات ہے۔

"منیجر نگار"

باب الاستفسار

نورِ محمدی اور پُلِ صراط

(جناب مرزا محمد مہدی صاحب - جبل پور)

عام طور پر مسلمانوں میں مشہور ہے کہ قیامت کے دن تمام آدمی ایک پُل سے گذریں گے جس کا نام صراط ہے۔ اور وہ بال سے زیادہ باریک تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔ پھر جو اچھے بندے ہیں وہ اس سے محفوظ گذر جائیں گے۔ اور جو گناہگار ہیں وہ نیچے جہنم میں گر جائیں گے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو لوگ قربانیاں کرتے ہیں انھیں جانوروں پر سوار ہو کر اس پل سے گذرینگے۔ بہت سے واعظوں کو بھی یہی بیان کرتے سنا گیا ہے۔ اور مولود کی اکثر کتابوں میں اسکا ذکر موجود ہے۔ براہ کرم مطلع فرمائیے۔ اسکی کیا حقیقت ہے اور کیا واقعی قرآن پاک یا احادیث میں اسکا ذکر ہے؟ اسی طرح نورِ محمدی کے متعلق میلاد کی کتابوں میں عجیب و غریب باتیں بیان کی گئی ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ سب احادیث سے ثابت ہیں؟

(نگار) آپ کیا پوچھتے ہیں کہ ان جاہل مولویوں اور کم عقل واعظوں نے کس کس طرح اسلام کو بدنام کیا ہے۔ اور ان کی گندہ تصانیف نے بانی اسلام پر کیا کیا تہمت تراشی ہے۔ ایک صراط پر کیا موقوف ہے۔ اور ہزاروں باتیں ایسی ہیں۔ جن کا پتہ نہ کلام پاک میں ہے اور نہ تعلیمات اسلامی میں۔ لیکن آج وہ عام مسلمانوں کے نہایت اہم عقاید میں شامل نظر آتی ہیں۔ جس زمانہ میں رسول اللہ مبعوث ہوئے ہیں۔ عرب میں موسوی۔ عیسوی اور زردشتی مذاہب کے اثرات ہر جگہ پائے جاتے تھے۔ اور ان کی روایات عام طور پر بیان کی جاتی تھیں۔ چونکہ عرب خود بُت پرست تھے۔ اور وہ کسی الہامی کتاب

رکھنے کے مدعی نہ تھے - اس لئے ان مذاہب سے بڑی حد تک مرعوب و متاثر ہو رہے تھے - اور ان کے خاندانوں میں ایک زمانۂ نامعلوم سے ان مذاہب کی بہت سی روایتیں منتقل ہوتی چلی آرہی تھیں -

جب ظہور اسلام ہوا اور اس نے عربوں کی ذہنیت کو ان تمام اساطیری خرافات سے پاک کرنا چاہا تو اسکو بہت دقتیں پیش آئیں - کیونکہ صدیوں سے جو باتیں ذہن میں مرتسم چلی آتی تھیں ان کا دفعتہً محو کرنا آسان نہیں تھا - تاہم اس نے اساس و بنیاد کی طور پر ایک ایسی چیز (کلام مجید) پیش کردی - جو اس نوع کے لغویات سے پاک تھی - اور ہر چند ابتدائے عہد اسلام میں لوگوں کو اس کے حقیقی مفہوم پر بحث و تحقیق کا موقعہ نہیں ملا - تاہم اس نے ایک ایسے صاف و سادہ مذہب کی داغ بیل ضرور ڈالدی - جو انسان کی عملی زندگی اور اس کے تمدنی تعلقات کے لحاظ سے نہایت ہی پائیدار اور بلند مستقبل اپنے اندر رکھتا تھا - لیکن افسوس ہے کہ نہ رسول اللہ نے اتنی عمر پائی کہ وہ اس بنیاد کو مستحکم کرجاتے - اور نہ آپ کے بعد خلفاء کو اندرونی سازشوں اور سیاسی جھگڑوں کیوجہ سے اس کی فرصت نصیب ہوئی - یہانتک کہ مذہب اسلام نام ہوگیا حکومت اسلام کا - اور قرآن کی جگہ لے لی احادیث نے - جو لاکھوں کی تعداد میں رسول اللہ کے نام سے گڑھی اور روایت کی جاتی تھیں - پھر ان احادیث میں سے ایک حصہ تو ایسا ہے جو صرف سیاسی مصالح کے بناء پر وضع کیا گیا - اور ایک حصہ وہ ہے جس میں دل کھولکر دیگر مذاہب کی ان تمام روایتوں کو لے لیا جو عرب خاندانوں میں رائج تھیں - اور تھوڑا سا تغیر کرکے ان کو "اسلامی چیز" کی حیثیت سے پیش کیا گیا - انھیں میں سے وہ احادیث بھی ہیں جو صراط (عوام کی زبان میں پل صراط) اور نور محمدی کے متعلق آپ کو میلاد کی کتابوں میں نظر آتی ہیں - اور یہ دونوں خیال صریح ایرانی روایات سے ماخوذ ہیں - لفظ صراط عربی لفظ نہیں ہے - بلکہ فارسی لفظ "چنوات" کا معرب ہے - اوستا میں ایک لفظ ہے "چنواتو پرتو مس" جس کے معنی ہیں "نیک و بد شمار کرنیوالے کا پل" - یہی لفظ مخفف ہوکر فارسی میں چنوات ہوا اور عربی میں صراط -

زردشتیوں میں اس پل کے متعلق جو روایت پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی روح کو ایک پل سے گذرنا پڑتا ہے - اور اس کے بعد اس کے نیک و بد اعمال کا احتساب ہوتا ہے - پہلوی کتاب دنکارت کی ایک عبارت ملاحظہ ہو:-

"میں تیری عبادت نیک خیال اور نیک عمل کیساتھ کرتا ہوں تاکہ میں روشنی کے راستہ میں رہوں - یہ دوزخ کے عذاب میں مبتلا نہ ہوں - اور پل چنوت کو عبور کرکے اس جگہ پہنچ جاؤں جو نکہتوں سے معطر اور سرتوں سے معمور ہے -"

اوستا میں بھی آپ کو یہی خیال نظر آئیگا - چنانچہ نیک عورتوں اور مردوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ:-

"انھیں بھی میں تم جیسے آدمیوں کی دعاؤں کے ذریعہ سے لے جاؤں گا اور تمام برکتوں کے ساتھ پل چنوات تک

اُن کی رہنمائی کروں گا۔" (لیسنا۔ ۴۶۔ ۱۰)

اس نوع کا عقیدہ نہ صرف قدیم ایرانیوں میں بلکہ تمام آریہ قوموں میں پایا جاتا ہے۔ اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جہاں جہاں وہ پہنچے یہ اعتقاد اپنے ساتھ لے گئے۔ چنانچہ ناروے اور سویڈن کی قدیم روایات میں ایک چیز "بفروسٹ" نظر آتی ہے۔ جسے عام طور پر "دیوتاؤں کا پُل" کہتے ہیں۔ اور اس سے مراد اُن کی غالباً قوس قزح ہے۔ یہی خیال ادنیٰ تغیر کے ساتھ یونانیوں میں بھی آیا۔ چنانچہ وہ قوس قزح کو دیوتاؤں کا قاصد کہا کرتے تھے۔ مرض صراط کے متعلق جو روایات مسلمانوں میں رائج ہوگئی ہیں وہ یکسر ایرانی روایات ہیں اور قول رسولؐ سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔

کلام مجید میں کم و بیش چالیس جگہ لفظ صراط استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن آپ کو کوئی ایک آیت بھی ایسی نہ ملیگی جس میں ان خرافات کی تصدیق کی گئی ہو۔ قرآن میں صراط کی صفت میں زیادہ تر لفظ مستقیم استعمال ہوا ہے۔ اور کہیں حمید اور سوی کے الفاظ۔ اور کسی ایک جگہ بھی راہ عمل کے علاوہ کوئی اور مفہوم نہیں لیا گیا۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ عربی زبان میں قبل بعثت نبوی لفظ صراط فارسی زبان کے لفظ چنوات سے معرب کرکے لے لیا گیا ہو۔ اور اسی کے ساتھ ایرانی روایات بھی اس کے متعلق رائج ہوگئی ہوں۔ لیکن کلام مجید میں لفظ صراط صرف راہ یا راستہ کے معنی میں لیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ایرانی روایات کا عدم شمول اس بات کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ اُن کی کوئی حقیقت و اصلیت نہیں ہے۔

نور محمدی کا ذکر کلام مجید میں کسی جگہ نہیں ہے۔ البتہ احادیث و روایات ضرور اس کے متعلق موجود ہیں کہ وہ کس طرح آدم سے منتقل ہوکر رفتہ رفتہ جناب آمنہ تک منتقل ہوا۔ لیکن یہ احادیث بھی بالکل غیر صحیح موضوع ہیں۔ اور رسول اللہ سے ان کو منسوب کرنا درست نہیں کیونکہ اس میں بھی وہی آرین روایات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ پارسیوں کی مذہبی کتاب اوستا میں بھی جمشید کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے اسی طرح کی ایک روایت پائی جاتی ہے۔ یہ جمشید وہی ہے جسے "یم کھشیت" بھی کہتے ہیں اور جس کے معنی "یم نورانی" کے ہیں۔ یم یا جم کا ذکر سنسکرت لٹریچر میں بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ رگ وید میں اسکو سب سے پہلا آدمی بیان کیا گیا ہے۔ ایرانی لٹریچر میں جم کے باپ کا نام "وِاِبوہنوت" درج ہے اور ہندوستانی روایات میں وِیوِسوت جو سورج کا دوسرا نام ہے۔ اور ہندوؤں کا سورج بنسی خاندان اسی کی یادگار ہے۔ اوستا کی روایت میں بھی اس نور کے نسلاً بعد نسل منتقل ہونیکا ذکر بالکل اسی طرح پایا جاتا ہے۔ جیسا اسلامی روایات میں۔ یعنی وہ نور پہلے جمشید کی پیشانی میں چمکا۔ اس کے بعد فریدوں میں منتقل ہوا اور پھر گرشاسپ میں۔

الغرض نور محمدی کے متعلق جو روایات پائی جاتی ہیں وہ بھی خرافات میں داخل ہیں اور رسول اللہ کے قول سے ان کو کوئی واسطہ نہیں۔ آپ کو اگر واقعی اسلام کا صحیح مفہوم معلوم کرنا ہو تو احادیث کو بالکل نظر انداز کر دیجئے اور صرف کلام مجید کا مطالعہ کیجئے۔ کہ وہی اصل چیز ہے اور وہی اصل بنیاد ہے تعلیمات اسلامی کی۔

جذباتِ عدم

ایک لمحہ :۔

بیخودی گھُل مل رہی ہے رفتہ رفتہ ہوش میں — جاگتا ہے اک تصوّر ذہن کے آغوش میں
اک تصوّر زندگی کے اک حسیں لمحہ کا خواب — خواب، جس سے ماند پڑ جائے طلوعِ ماہتاب

وہ مرے محراب در سے اس طرح گذرے ندیم! — جیسے اک اُجڑے ہوئے مندر میں داخل ہو نسیم
آہ اُس شاعر کا گھر، جو ہو پرستارِ جمال — ہوں، زسرتاپا، نمازیں عشق کی جس کے خیال!
معبدِ ویراں نہیں تو اور کیا ہے ہمنشیں — ایسا معبد جس کو کہیئے، اک مناجاتِ حسیں
جس کے ہر ذرّے کو ہو اک دیوتا کا انتظار — جس کی ویرانی کا مطلب ہو خدا کا انتظار

شام کے حیراں دھندلکوں میں تھا اک ادراکِ راز — اور خموشی سے ٹپکتی تھی محبّت کی نماز
میرے گھر کی شمع، میرے عشق کی غماز تھی — ناتواں سی روشنی میں درد کی آواز تھی
روبرو بیٹھے تھے وہ میرے اور اُن کی ہر نظر — کر رہی تھی مجھ کو اسرارِ بقا سے باخبر
آہ ادراکِ الوہیّت کا حسنِ لازوال — مِٹ چکا تھا دل سے اس دُنیا کا ہر فانی خیال

او زمانے میرا وہ لمحہ بھی تیرے پاس ہے
اپنے روحانی خسارے کا مجھے احساس ہے

خامشی :۔

خامشی اک غیر مرئی حسن ہے تخیّل کا — جلوۂ صد رنگ، حسنِ صوت کی تحلیل کا

کیا تخیّل آفریں ہے رسم و راہِ خامشی — فلسفہ کیا ہے؟ جلالِ بارگاہِ خامشی
عقل کی صناعیوں کو جانچتی ہے خامشی — فکر کی گہرائیوں کو جانچتی ہے خامشی
خامشی قدرت کا وہ ایمائے غور و فکر ہے — لمحہ لمحہ جس کا اک دریائے غور و فکر ہے
خامشی سرگوشیوں کا اک طلسمی ساز ہے — ایک بھولی، بسری اور بھٹکی ہوئی آواز ہے
خامشی، ذی روح، پُراسرار، زندہ خامشی — آشنائے لذتِ گفتار، زندہ خامشی
میری پنہاں قوتوں کا امتحاں ہے خامشی — بھید ہے اور اک نہاں کی راز داں ہے خامشی
خامشی سے معنیٔ حُسن آفریں لیتا ہوں میں — فکر کی کشتی کو جوئے نور میں کھیتا ہوں میں
دیکھتی ہے خامشی کے حسن کو چشمِ خیال — خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں اسرارِ جمال
خامشی کی گونج میں ہے ایک روحانی صدا — جس میں میں گم ہو گیا ہوں، کھو گیا ہوں، بارہا
کیا بتاؤں تجھ کو اے ہمدم! کہ کیا ہے خامشی — خامشی تو ہے مگر جانِ نوا ہے خامشی!

کچھ نہیں کھلتا کہ خاموشی ہے یا آواز ہے
شاید فطرت کی یہ بھی اک ادائے ناز ہے

بادل اور کہسار:-

کوہسار اور بادلوں کے جمگھٹے، شام اور شفق — ڈوبتے سورج کا رومان آفریں جام اور شفق
بادلوں میں کیف و رعنائی کی تصویروں کے نقش — مستیوں کے خال و خد، صد رنگ تنویروں کے نقش
روح پرور رنگ، دلکش سائے، نورانی غبار — کچھ حقیقت، کچھ تصور کا طلسمِ سحر کار
ہلکی ہلکی تیرگی میں دھیمی دھیمی سرخیاں — سرخیوں میں حیرت افزا داستانوں کا جہاں!
چھن رہا ہے بادلوں سے رنگ و طلعت کا غبار — نور کے چھینٹوں کے اندر جیسے پھولوں کی پھوار
دور کا کوئی افق ہے چشمِ دل کے سامنے — سرخ آنچل جس پہ پھیلائے ہیں اپنے شام نے
رقص میں مشغول ہیں پریاں، گھٹائیں اوڑھ کر — شعریت سر دھن رہی ہے حسن کے ہر انداز پر
ذہن میں لہرا رہے ہیں کچھ سہانے خواب سے — چھو رہے ہیں بربطِ تخیل کو مضراب سے!
آ رہی ہے دھیمے دھیمے مست گیتوں کی صدا — بج رہا ہے آنکھ سے اوجھل، کہیں اک ساز سا

جس کو سن کر رفتہ رفتہ جھومتا جاتا ہوں میں
خواب میں جیسے کسی کو چومتا جاتا ہوں میں

جانِ تغزّل:۔

ہوش کھو دیتا ہوں، اور وجد میں آ جاتا ہوں　　وسعتِ حُسنِ تصوّر میں سما جاتا ہوں
تم تماشائی بنے تھے، تو تماشا بھی بنو۔　　مر کے میں، اَب تمہیں دیوانہ بنا جاتا ہوں
ڈوب جاتا ہوں خیالات کی گہری رَو میں　　اور کسی دوسرے عالم میں چلا جاتا ہوں
چاندنی راتوں میں، وہ اُن کی ملاقات کا کیف　　رخصت! اے ہوش! کہ بیہوش ہوا جاتا ہوں
بے حقیقت نظر آنے لگے شکوے اپنے　　تیری گفتار کے دھارے پہ بہا جاتا ہوں
آہ! انسان ہوں پھنس جاتا ہوں باتوں میں، مگر　　چوٹ لگتی ہے تو پھر ہوش میں آ جاتا ہوں

نبض کونین پر انگلی تو ذرا رکھنا عدم!
دُنیا بُجھتی ہے کہ میں آپ بُجھا جاتا ہوں؟

اضداد کی آویزش، یہ فطرتِ دُنیا ہے　　ساحل سے ہر اک طوفاں ٹکرا کے گذرتا ہے
جلوے کی حقیقت ہم، معلوم کریں کس سے　　جو اہلِ نظر ہے وہ حیرانِ تماشا ہے
دیوانے گذشتہ اور آئندہ کو کیا جانیں　　اس حال سے وابستہ، ماضی ہے نہ فردا ہے
دلدوز حقائق سے اچھے ہیں حسیں دھوکے　　رنگین فریبوں میں تسکینِ تمنا ہے
تقدیر، زبردستی ہے کاتبِ قدرت کی　　تدبیر، بشر کا اک معقول تقاضا ہے
محویت و سرشاری، بدہوشی و بے خبری　　نادان تماشائی! تو آپ تماشا ہے

طغیانیٔ غم دل میں اور ضبطِ فغاں، توبہ!
نادان عدم! شاید جل بُجھنے کا سودا ہے

ایک مکتوب

ایک عزیز دوست کے نام:۔

وہ دَورِ زیست کہ جس سے گذر رہا ہوں میں　　وہ تجرباتِ دل افگن جو کر رہا ہوں میں

گلا ہے۔ نطق و تکلم میں آ نہیں سکتے — کہ لفظ بارِ معانی اُٹھا نہیں سکتے
بہت سی سادہ و معصوم و دلربا خوشیاں — ہزار دلکش و شاداب و بے بہا خوشیاں
ہوا تھا جس سے محبت کا افتتاح کبھی — تھی جن کے دم سے درخشاں مری ہر ایک گھڑی
گئی ہیں ایسی، کہ اُن کا نشاں نہیں ملتا — نشاطِ رفتہ کا رنگیں سماں نہیں ملتا

~~~

کسی نے شوق سے رودادِ آرزو بھی سُنی — مری فسردہ نگاہوں کی گفتگو بھی سُنی
سکوت کا وہ تکلم، جو ہے زبانِ دل کی — وہ خامشی جو ازل سے ہے ترجمانِ دل کی
وہ التجائے نظر، جس کو عشق کہتے ہیں — وہ اشک، جن میں محبت کے درد رہتے ہیں
مشاہدہ کیا اُس نے تمام باتوں کا — مرے اُداس دنوں کا، خموش راتوں کا
اور اب بھی حال سے میرے، وہ ناشناس نہیں — نہیں، کہ اسکو مرے دردِ دل کا پاس نہیں
ہے احترام مرے عشق کا اُسے دل سے — خدا و بندہ یہ دو جزو ہیں محبت کے
مگر بہ ایں ہمہ ربط و نیاز و صدق و صفا — ہمارے عشق کی رسوائیاں ہیں رنج فزا

~~~

عزیز دوست! یہ دُنیا عجیب دُنیا ہے — کہ حق کو بھی یہاں بدنامیوں کا کھٹکا ہے
دلوں کو ملتے ہوئے کون دیکھتا ہے یہاں — گلوں کو کھلتے ہوئے کون دیکھتا ہے یہاں
وہ چیز جس کا خدا احترام کرتا ہے۔ — زمانہ اس کا ہمیشہ سے نام دھرتا ہے

~~~

زمانہ مار چکا مجھ کو، کر چکا پامال — ہے سامنے، مگر، اپنی بقا کا اَب تو سوال
دبا ہوں جتنا، اب اُتنا مجھے اُبھرنا ہے — جدید شان سے، تجدیدِ زیست کرنا ہے
کہوں گا اُس کو، علی الرغم اہلِ دہر، خدا — زبانِ خلق کی مجھ کو نہیں ہے اَب پروا
میں بےشعوریٔ دُنیا پہ مُسکراؤں گا — کہ ہو کے دہر میں بدنام، جھوم جاؤں گا
جہاں کی عقل کا کیا دخل میرے کاموں میں — مرے حسین دنوں میں، لطیف شاموں میں

جنونِ عشق پہ میں ناز کر کے چھوڑوں گا
جہاں کو اَب نظر انداز کر کے چھوڑوں گا

عدم
~~~

رباعیات آسی

اک سمت نظر فریبی جرم و قصور
اک سمت شراب عفت حق کا سرور
یہ دام گہ خیال یعنی دنیا
آسی ہمیں اک نہ اک میں پھانسے گی ضرور

اس سے دورِ شباب کی رونق ہے
اس سے بے لطفیوں کا چہرہ فق ہے
توبہ کس منہ سے کر رہا ہے ظالم
تیرے اوپر گناہ کا بھی حق ہے

دامانِ ثباتِ عیش سیتا ہوں میں
پینا مجھے چاہیئے کہ جیتا ہوں میں
اللہ رحیم اور شیطان رجیم
اچھا تو پھر اب شراب پیتا ہوں میں

انسان خودی کا اپنی کیا مالک ہے
ہر چیز کی اس کے اک بلا مالک ہے
بھیجا تھا لیے خدا نے بندوں کی طرف
بندوں نے کہا کہ جا خدا مالک ہے

اس جود کو اور اس سخا کو دیکھا
اس لطف کو اور اس عطا کو دیکھا
جس کا بندا نہیں بجز تیرے کوئی
دیکھا واعظ ترے خدا کو دیکھا

دل خوش ہو تو آہ بھی جگر سے نکلے
ہنستے ہوئے اشک چشم تر سے نکلے
پینا ہے تو پی کے شب کو توبہ کر لے
ہو[illegible]یا جانے کل کدھر سے نکلے

نغمہ بھی حرام نوحہ خوانی بھی حرام
[illegible]ے ہی نہیں مستی جوانی بھی حرام
اس جینے سے فائدہ ہی کیا ہے آسی
کہدے کوئی کاش زندگانی بھی حرام

سرگرم غرور و کبریا ہیں لاکھوں
آمادہ دعوئی انا ہیں لاکھوں
آیا ہے عجب یہ دور الٹا آسی
بندا نہیں ایک بھی خدا ہے لاکھوں

بگڑے نہ غریب بادہ نوشوں کا بھی حال
اور حکم بھی ہوں نہ واعظوں کے پامال
اب بھی جو حرام کرنے والا مے کو
عقبیٰ میں حرام کر دے دنیا میں حلال

اے حضرتِ زاہد معلّے القاب
دیجئے مرے اک سوال کا مجھ کو جواب
دوزخ میں رہیں گے جب شرابی سارے
تو کون پیئے گا جا کے جنت میں شراب

ہو جاتا ہوں پست جب ابھرتا ہوں میں
مغروری نفس بد سے ڈرتا ہوں میں
ہوتا ہے خلوص توبہ جس دن دل میں
اس روز گنہ ضرور کرتا ہوں میں